امامت و رہبری

تالیف

آیت اللہ شہید مطہریؒ

کتاب کا نام ——— امامت و رہبری

تالیف ——— آیت اللہ شہید مطہری رح

ترجمہ ——— جناب سید احتشام عباس زیدی

ناشر ——— سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی

ادارہ ترجمہ و اشاعت

سال طبع ——— ربیع الثانی ۱۴۱۷ ھ ق

ISBN 964-6177-08-5

فہرست

بسمہ تعالیٰ

عرضِ ناشر

کتاب انسانی فکر کی ترسیل اور انسانی تہذیب و ثقافت کے ارتقائی خطوط کو مجسم کرنے میں امتیازی کردار ادا کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی فکر انسانی افکار کی ان بلند بام چوٹیوں میں سے ہے جو انسانوں کو اسلامی خصوصیات اور اس کے منابع و مآخذ سے آگاہ کرتی ہے اور اس کے سامنے زندگی کے حقائق کا وسیع تر نظریہ پیش کرتی ہے۔

اس حقیقت کو درک کرنے کے بعد خدائے علیؔ و قدیر پر بھروسہ کرتے ہوئے ہم نے بھی اپنی استطاعت و بضاعت کے بقدر اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ عظیم اسلام کی خدمت کی توفیق کرامت فرمائے۔ انہ السمیع المجیب

سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی

ادارۂ ترجمہ و اشاعت

پیش لفظ

انسان ایک سماجی اور معاشرتی وجود ہے وہ سماجی زندگی سے الگ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس کی سماجی زندگی کا سب سے چھوٹا دائرہ ایک خانوادہ ہے اور بڑا دائرہ ہزاروں خاندانوں اور قبیلوں پر مشتمل ایک عظیم سماج ہے۔ یہی انسان کی حقیقی پہچان ہے۔ قرآن کریم اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: یاایھا الانسان اناخلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبًا وقبائلاً لتعارفوا۔

انسان کی سماجی زندگی اس کی احتیاج اور ضرورتوں کو آشکار کرتی ہے۔ ضرورتوں کی تکمیل باہمی تعاون سے ہی ممکن ہے لیکن اگر انسان خودغرضی پر اتر آئے اور دوسروں کا خیال نہ کرتے ہوئے صرف اپنے بارے میں سوچے، اپنی احتیاجات کی تکمیل کرے اور اپنی ضرورت سے بڑھ کر اپنے لئے چاہے تو یہی وہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے انسانی سماج میں ہرج ومرج، بے اعتدالی ظلم وستم، لوٹ مار اور قتل وغارت کی ابتداء ہوتی ہے۔

آخر انسانی معاشرہ میں انسانوں کی ضرورتوں کی تکمیل کیسے ہو، انسان باہمی تعاون پر کیسے آمادہ ہو۔ سماج میں نابرابری، بے اعتدالی، ظلم وستم کو کیسے روکا جائے۔ عدل وانصاف سکون واطمینان اور خوشحالی کی فضا کیسے قائم کی جائے، اس کے لئے سماج میں ایک قیادت کی ضرورت ہے جو سماج کو ایک نظم دے سکے اور انسانی فلاح کے لئے ایک نظام قائم کرسکے۔ یہ بدیہی سی بات ہے کہ ہر نظام کو قائم کرنے اور چلانے کے لئے ایک رہبر، قائد اور امام ضروری ہے اور یہ بھی بدیہی ہے کہ انسانی سماج میں نظم وضبط قائم کرنے کے لئے اب تک انسان کے خودساختہ دستوں

نظام زندگی وجود میں آئے، لیکن کہیں نظام کا نقص نظر آیا اور کہیں قائد و رہبر کا۔

اسلام نے قرآن کی شکل میں انسانی سماج کو کامل ترین نظام حیات عطا کیا۔ خالق انسان نے انسان کی فطرت سے پوری آگاہی کے ساتھ بالکل فطری نظام زندگی انسان کے حوالے کیا لیکن اس فطری نظام کو عملی شکل دینے اور معاشرہ میں اس کے ذریعہ مکمل اعتدال قائم کرنے کیلئے انسانی فطرت سے مکمل طور پر آشنا اور انسانی غلطیوں، کوتاہیوں، ظلم، ناانصافی اور بے اعتدالی سے بالکل پاک و پاکیزہ یعنی معصوم انسان ضروری ہے جو رہبر و امام کی شکل میں اس الٰہی نظام سے بخوبی آشنا ہو اور اسے یوں چلائے جو اس نظام کا حق ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ظالم خواہ چھوٹا ہو یا بڑا انسانی معاشرہ کی حقیقی قیادت و امامت نہ کر سکتا ہے اور نہ اس کا حقدار ہے: "قال و من ذریتی قال لا ینال عھدی الظالمین" جب خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کو امامت کا منصب عطا فرمایا تو آپ نے اپنی ذریت کیلئے بھی اس کا تقاضا کیا۔ ارشاد ہوا کہ انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کیلئے ضروری ہے کہ میرا عہد یعنی یہ منصب امامت کسی ظالم کے ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔ یہ تو ہے انسانی سماجی حیثیت سے حقیقی اور واقعی امامت و قیادت کا ایک پہلو، امامت کی اس سے کہیں بڑی تصویر یہ ہے کہ امام کو معصوم ہونا چاہئے۔ آیت تطہیر اسی کا اعلان کرتی ہے۔ امام ولی خدا اور زمین پر اس کی حجت ہوتا ہے، آیت ولایت اسی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ امامت انسانوں میں محبت و دوستی اور خدا سے قرب کا ملجا و ماویٰ ہے، آیت مودت اسی کا اظہار کرتی ہے۔ امام روئے زمین پر خلیفۃ اللہ اور حجت اللہ ہے وہ انسان اور خدا کے درمیان سب سے مضبوط رشتہ اور "حبل اللہ المتین" ہے۔

"امامت و رہبری" کے موضوع پر مفکر اسلام حضرت آیت اللہ شہید مطہریؒ کی ایک بیش بہا تحریر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اہم، حجم کے لحاظ سے مختصر لیکن جامع، یہ کتاب ہر مکتب فکر کے قاری کے لئے ایک قیمتی ہدیہ ہے۔

"ادارہ"
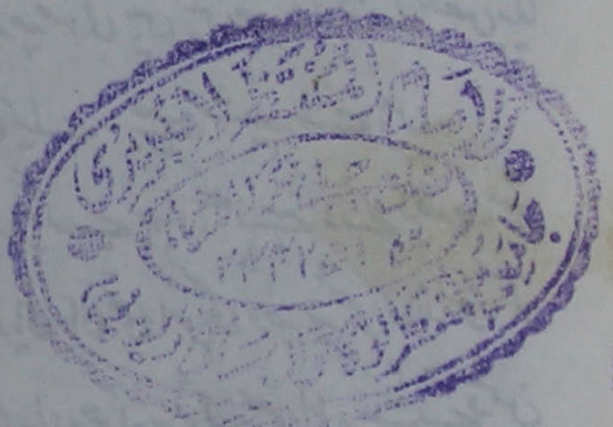
ہماری بحث مسئلہ امامت سے متعلق ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسئلہ امامت کو ہم شیعوں کے یہاں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جبکہ دوسرے اسلامی فرقوں میں اسے اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔ راز یہ ہے کہ شیعوں کے یہاں امامت کا جو مفہوم ہے وہ دوسرے تمام اسلامی فرقوں سے مختلف ہے۔ اگرچہ بعض مشترک پہلو بھی پائے جاتے ہیں، لیکن شیعی عقائد میں امامت کا ایک مخصوص پہلو بھی ہے اور یہی پہلو امامت کو غیر معمولی اہمیت کا حامل بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم شیعہ اصول دین کو شیعی نقطۂ نظر کے مطابق بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصول دین، توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت کا مجموعہ ہے۔ یعنی امامت کو اصول دین کا جزو شمار کرتے ہیں۔ اہل تسنن بھی ایک طرح کی امامت کے قائل ہیں۔ بنیادی طور سے امامت کے منکر نہیں ہیں وہ اسے دوسری شکل سے تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن وہ جس نوعیت سے تسلیم کرتے ہیں، اس میں امامت اصول دین کا جزو نہیں ہے بلکہ فروع دین کا جزو ہے۔ بہرحال ہم دونوں امامت کے مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ ایک اعتبار سے امامت کے قائل ہیں اور ہم دوسرے اعتبار سے امامت کو تسلیم کرتے ہیں۔ آخر یہ کیسے ہوا کہ شیعہ امامت کو اصول دین کا جزو مانتے ہیں اور اہل سنت اسے فروع دین کا جزو سمجھتے ہیں؟ اس کا سبب وہی ہے جو عرض کر چکا ہوں کہ شیعہ اور اہل سنت کے یہاں امامت کے مفہوم میں فرق ہے۔

امام کے معنی

امام کے معنی ہیں پیشوا یا رہبر۔ لفظ امام، پیشوا یا رہبر بذات خود کوئی مقدس مفہوم نہیں رکھتے۔

پہلی بحث

امامت کے معانی و مراتب

پیشوا یا رہبر سے مراد ہے، آگے آگے چلنے والا جس کا اتباع یا پیروی کی جائے۔ چاہے وہ پیشوا عادل ہدایت یافتہ اور صحیح راہ پر چلنے والا ہو یا باطل اور گمراہ ہو۔ قرآن نے بھی لفظ امام کو دونوں معنی میں استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:۔

"وجعلناهم أئمة يهدون بامرنا" (انبیاء/۷۳)

ہم نے ان کو امام قرار دیا ہے جو ہمارے حکم سے ہدایت و رہبری کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرماتا ہے:۔

ائمة يدعون الى النار (قصص/۴۱)

وہ امام جو لوگوں کو جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔

یا مثلاً فرعون کے لئے بھی امام سے ملتے جلتے مفہوم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے: يقدم قومه يوم القيامة[1] "وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔" معلوم ہوا کہ لفظ امام سے مراد پیشوا یا رہبر ہے۔ ہمیں اس وقت باطل پیشوا یا رہبر سے سروکار نہیں ہے، یہاں صرف پیشوا یا رہبر کا مفہوم عرض کرنا مقصود ہے۔

پیشوائی یا امامت کے چند مقامات ہیں جن میں سے بعض موارد میں اہل سنت بھی امامت کے قائل ہیں البتہ اس کی کیفیت اور مصداق میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن امامت کے بعض مفاہیم میں وہ سرے سے اس طرح کی امامت کے منکر ہیں۔ نہ یہ کہ وہ امامت کے تو قائل ہوں مگر مصداق میں ہم سے اختلاف رکھتے ہوں۔ جس امامت کے وہ قائل ہیں لیکن اس کی کیفیت و شکل اور افراد میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں اس سے مراد معاشرہ کی رہبری و سرپرستی ہے۔ چنانچہ یہی یا اس سے ملتی جلتی تعبیر زمانۂ قدیم سے متکلمین کی کتابوں میں بھی ذکر ہوئی ہے۔ خواجہ نصیرالدین طوسی نے اپنی کتاب "تجرید الاعتقاد" میں امامت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے "ریاسة عامة" یعنی عمومی ریاست و حاکمیت" (یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے)

رسول اکرمؐ کی حیثیت

پیغمبر اکرمؐ، دین اسلام کی خصوصیت و جامعیت کی بنا پر قرآن اور خود اپنی سیرت طیبہ کے مطابق اپنے زمانہ میں کئی حیثیتوں اور ذمہ داریوں کے حامل تھے، یعنی ایک ہی وقت میں کئی امور آپ کے

---

[1] سورۂ ہود/آیت نمبر ۹۸

ذمہ تھے اور آپ کئی منصبوں پر کام کر رہے تھے چنانچہ پہلا منصب جو خداوند عالم کی جانب سے آپ کو عطا ہوا تھا اور جس پر آپ عملی طور سے کاربند تھے، پیغمبری و رسالت تھی۔ یعنی آپ الٰہی احکام و قوانین کو بیان فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن کا ارشاد ہے: "ما آتاکم الرسول فخذوه وما نهیکم عنه فانتهوا"[1] یعنی جو کچھ پیغمبر تمہارے لئے لایا ہے اسے اختیار کرلو اور جن چیزوں سے تمہیں منع کرتا ہے انہیں چھوڑ دو۔ یعنی پیغمبر احکام و قوانین سے متعلق جو بھی کہتا ہے خدا کی جانب سے کہتا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر صرف ان چیزوں کا بیان کرنے والا ہے جو اس پر وحی کی شکل میں نازل ہوئی ہیں۔ دوسرا منصب جس پر پیغمبر اسلام فائز تھے قضاوت کا منصب تھا یعنی وہ تمام مسلمانوں کے درمیان قاضی کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیونکہ اسلام کی نظر میں منصب قضاوت بھی کوئی یوں ہی سا بے معنی منصب نہیں ہے کہ جہاں کہیں دو آدمی آپس میں اختلاف کریں ایک تیسرا آدمی قاضی بن کر فیصلہ کر دے۔ قضاوت اسلامی نقطۂ نظر سے ایک الٰہی منصب ہے کیونکہ یہاں عدل کا مسئلہ درپیش ہے۔ قاضی وہ ہے جو نزاع و اختلافات کے درمیان عادلانہ فیصلہ کرے۔ یہ منصب بھی قرآن کے مطابق خداوند عالم کی جانب سے پیغمبر اکرم کو تفویض ہوا اور آپ خدا کی جانب سے حق رکھتے تھے کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ فرمائیں: "فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما"[2] معلوم ہوا یہ بھی ایک الٰہی منصب ہے کوئی معمولی عہدہ نہیں ہے اور پیغمبر عملی طور پر قاضی بھی تھے۔ تیسرا منصب جس پر پیغمبر قانونی طور سے فائز تھے یعنی جو قرآن کی رو سے آپ کو عطا کیا گیا تھا اور آپ اس پر عمل پیرا بھی تھے، یہی ریاست عامہ ہے یعنی وہ مسلمان معاشرہ کے حاکم و رہبر تھے۔ دوسرے لفظوں میں آپ مسلمانوں کے نگراں اور اسلامی معاشرہ کے سرپرست تھے۔ کہتے ہیں کہ: "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر تمہارے معاشرے کا حاکم و رہبر ہے۔ وہ تمہیں جو حکم دے اسے تسلیم کرو۔ لہٰذا یہ تینوں منصب صرف ظاہری اور دکھاوے کے نہیں ہیں بلکہ بنیادی طور پر پیغمبر سے

---

[1] سورۂ حشر / آیت نمبر ۷

[2] سورۂ نساء / آیت ۶۵ - پس نہیں اے رسول تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے جب تک اپنے اختلافات اور دشمنیوں میں تمہیں حاکم نہ بنائیں۔ اور تم جو کچھ فیصلہ کر دو اس سے دل تنگ نہ ہوں بلکہ دل و جان سے اسے تسلیم کرلیں۔

ہم تک جو کچھ پہنچا ہے اس کی تین حیثیتیں ہیں۔ ایک پیغمبرؐ کا وہ کلام جو فقط وحی الٰہی ہے۔ یہاں پیغمبرؐ بذات خود کوئی اختیار نہیں رکھتے جو حکم خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ اسے پہنچانے کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں وہ دینی قوانین بیان کرتے ہیں کہ نمازیوں پڑھو، روزہ ایسے رکھو وغیرہ۔ وہاں رسولؐ کا ارشاد حکم خدا اور وحی ہے۔ لیکن جب وہ لوگوں کے درمیان قضاوت کرتے ہیں اس وقت ان کے فیصلے وحی نہیں ہوتے۔ یعنی دو آدمی آپس میں جھگڑتے ہیں، پیغمبرؐ اسلامی قوانین کے مطابق دونوں کے درمیان فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ حق مثلاً اس شخص کے ساتھ ہے یا اس شخص کے۔ اب یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ جبرئیل پیغمبرؐ پر نازل ہوں اور وحی کے ذریعہ بتائیں کہ اے رسول یہاں آپ کہئے کہ حق اس شخص کے ساتھ ہے یا نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی استثنائی موقع ہو تو دوسری بات ہے۔ ورنہ کلی طور پر پیغمبرؐ کے فیصلے ان ہی ظاہری بنیادوں پر ہوتے ہیں جن پر دوسرے فیصلہ کرتے ہیں فرق یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے فیصلے بہت ہی دقیق اور اعلیٰ سطح کے ہوتے ہیں۔ آپؐ نے خود ہی فرمایا ہے کہ میں ظاہر پر حکم کرنے کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ یعنی مثلاً مدعی اور مدعا علیہ اکٹھا ہوں اور مدعی کے ساتھ دو عادل گواہ بھی ہوں تو پیغمبرؐ اسی ثبوت کی بنیاد پر فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں۔ یہ وہ فیصلہ ہے جو خود پیغمبرؐ نے فرمایا ہے۔ (آپ پر وحی نہیں نازل ہوئی ہے)

تیسری حیثیت بھی جس کے بموجب پیغمبرؐ معاشرہ کے نگراں اور رہبر ہیں، اگر اس کے تحت وہ کوئی حکم دیں تو یہ حکم بھی اس فرمان سے مختلف ہوگا جس میں پیغمبرؐ وحی خدا کو پہنچاتے ہیں۔ خدا نے آپ کو ایسی ہی حاکمیت و رہبری کا اختیار دیا ہے اور ایک حق کی صورت میں آپ کو یہ منصب عطا فرمایا ہے اور وہ بھی رہبر ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں لہٰذا اکثر آپؐ (بعض) امور میں لوگوں سے مشورہ بھی فرماتے ہیں۔ چنانچہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ آپ نے بدر اور احد کی جنگوں میں، نیز بہت سے دوسرے مقامات پر اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا، جبکہ حکم خدا میں تو مشورہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ کیا کبھی پیغمبرؐ نے اپنے اصحاب سے یہ مشورہ بھی لیا کہ مغرب کی نماز ایسے پڑھی جائے یا ویسے؟ بلکہ اکثر ایسے مسائل پیش آتے تھے کہ جب آپؐ سے ان موضوعات سے متعلق پوچھا جاتا تھا تو صاف فرما دیا کرتے تھے کہ ان مسائل کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی جانب سے ہی ایسا ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا۔ لیکن (احکام خدا کے علاوہ) دوسرے

مسائل میں پیغمبرؐ اکثر مشورہ فرماتے تھے، اور دوسروں کی رائے دریافت کیا کرتے تھے۔ اب اگر کسی موقع پر پیغمبرؐ کوئی حکم دیں کہ ایسا کرو تو یہ اس اختیار کے تحت ہے جو خدا نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ ہاں اگر کسی

سلسلہ میں مخصوص طور پر وحی بھی نازل ہو جائے تو ایک استثنائی بات ہو گی۔

اس کو عام مسائل سے الگ سمجھا جائے گا نہ یہ کہ تمام امور اور جزئیات میں معاشرہ کا حاکم و رہبر ہونے کی حیثیت سے معاشرہ کے لئے پیغمبرؐ جو کام بھی انجام دیتے تھے، خدا اس کے لئے ان پر وحی نازل فرماتا تھا کہ یہاں یہ کرو، وہاں وہ کرو۔ اور اس طرح کے مسائل میں بھی پیغمبرؐ صرف ایک پیغام رساں کی حیثیت رکھتا رہا ہو!! لہٰذا پیغمبر اسلامؐ یقینی طور پر بیک وقت ان متعدد منصبوں پر فائز رہے ہیں۔

امامت معاشرہ کی حاکمیت کے معنی میں

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، امامت کا مطلب اپنے پہلے معنی کے مطابق "ریاست عامہ" ہے۔ یعنی پیغمبرؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اس کا وہ عہدہ جسے معاشرہ کی رہبری کہتے ہیں، خالی ہو جاتا ہے۔ اور اس سے کسی کو انکار نہیں کہ انسانی معاشرہ ایک رہبر کا محتاج ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے بعد معاشرہ کا حاکم و رہبر کون ہے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جسے بنیادی طور پر شیعہ بھی تسلیم کرتے ہیں اور سنی بھی۔ شیعہ بھی کہتے ہیں کہ معاشرہ کو ایک اعلیٰ رہبر و قائد اور حاکم کی ضرورت ہے اور سنی بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں خلافت کا مسئلہ اس شکل میں سامنے آتا ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اپنے بعد ایک حاکم و رہبر معین کر دیا اور فرمایا کہ میرے بعد مسلمانوں کے امور کی زمام علیؑ کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے اور اہل سنت اس منطق سے اختلاف کرتے ہوئے کم از کم اس شکل میں جس شکل میں شیعہ مانتے ہیں یہ بات قبول نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں پیغمبرؐ نے کسی خاص شخص کو معین نہیں فرمایا تھا۔ بلکہ یہ خود مسلمانوں کا فرض تھا کہ پیغمبرؐ کے بعد اپنا ایک حاکم و رہبر منتخب کریں۔ چنانچہ وہ بھی بنیادی طور پر امامت و پیشوائی کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک حاکم و رہبر ضرور ہونا چاہئے بس اختلاف یہ ہے کہ ان کے نزدیک رہبر انتخاب کے ذریعہ معین ہوتا ہے اور شیعہ کہتے ہیں کہ

حاکم و رہبر کو خود پیغمبرؐ نے وحی الٰہی کے ذریعہ معین فرما دیا ہے۔

اگر مسئلہ امامت یہیں تک محدود رہتا اور بات صرف پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کے سیاسی رہبر کی ہوتی تو انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم شیعہ بھی امامت کو اصول دین کے بجائے فروع دین کا جزو قرار دیتے اور سمجھتے کہ یہ بھی نماز کی طرح ایک فرعی مسئلہ ہے لیکن شیعہ جس امامت کے قائل ہیں وہ اس قدر محدود نہیں ہے کہ چونکہ علیؑ بھی دیگر اصحاب مثلاً ابوبکر، عمر، عثمان اور سیکڑوں اصحاب یہاں تک کہ سلمان و ابوذر کی طرح پیغمبرؐ کے ایک صحابی تھے لیکن علیؑ ان سب سے برتر و افضل، سب سے زیادہ عالم، سب سے زیادہ متقی اور باصلاحیت تھے اور پیغمبرؐ نے بھی انھیں معین فرما دیا تھا۔ نہیں، شیعہ صرف اسی حد پر نہیں ٹھہرتے بلکہ امامت کے سلسلہ میں دو اور پہلوؤں کے قائل ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کو بھی اہل تسنن سرے سے نہیں مانتے ایسا نہیں ہے کہ امامت کی ان دو حیثیتوں کو تو مانتے ہوں لیکن علیؑ کی امامت سے انکار کرتے ہوں، نہیں! ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ امامت دینی مرجعیت کا عنوان رکھتی ہے۔

امامت دینی مرجعیت کے معنی میں

ہم عرض کر چکے ہیں کہ پیغمبرؐ وحی الٰہی کی تبلیغ کرنے والے اور اس کا پیغام پہنچانے والے تھے۔ لوگ جب متن اسلامی کے بارہ میں جاننا چاہتے تھے یا قرآن میں کوئی مطلب نہ پاتے تھے تو پیغمبرؐ سے سوال کرتے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسلام جو کچھ معارف، احکام اور قوانین بیان کرنا چاہتا تھا کیا وہ سب کے سب وہی ہیں جو قرآن میں آگئے ہیں اور پیغمبرؐ نے بھی عام طور سے لوگوں کے سامنے بیان کر دیے ہیں؟ یا نہیں، بلکہ قہری طور سے زمانہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ پیغمبرؐ تمام قوانین و احکام عام طور سے لوگوں میں بیان کر دیں۔ علیؑ پیغمبرؐ کے وصی و جانشین تھے اور پیغمبرؐ نے اسلام کی تمام چھوٹی بڑی باتیں یا کم از کم اسلام کے تمام کلیات علیؑ سے بیان کر دیے اور انہیں ایک بے مثال عالم غیر معلم، اپنے اصحاب میں سب سے ممتاز ان ہی کی طرح اپنی باتوں میں خطا و لغزش سے بری اور خدا کی جانب سے نازل ہونے والی تمام باتوں سے واقف شخصیت کے عنوان سے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اے لوگو۔ میرے بعد دینی مسائل میں جو کچھ پوچھنا ہو میرے اس وصی و جانشین اور اس کے بعد آنے والے تمام اوصیا سے سوال کرنا۔ درحقیقت یہاں امامت ایک کامل اسلام شناس کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ لیکن یہ

اسلام شناس ایک مجتہد کی حد سے کہیں بالاتر ہے۔ اس کی اسلام شناسی منجانب اللہ ہے اور (ائمہ) یعنی واقعی اسلام شناس۔ البتہ یہ وہ افراد نہیں ہیں جنھوں نے اپنی عقل و فکر کے ذریعہ اسلام کو پہچانا ہو جن کے یہاں قہری طور پر خطا و اشتباہ کا امکان بھی پایا جاتا ہو۔ بلکہ انہوں نے ان غیبی اور مرموز ذرائع سے اسلامی علوم پیغمبرؐ سے حاصل کئے ہیں جو ہم پر پوشیدہ ہیں۔ اور یہ علم پیغمبرؐ سے علیؑ تک اور علیؑ سے بعد کے ائمہ تک پہنچا ہے۔ اور ائمہؑ کے پورے دور میں یہ علم خطاؤں سے بری، معصوم علم کی صورت میں ایک امام سے دوسرے امام تک پہنچتا رہا ہے۔

اہل سنت کسی شخص کے لئے اس منزلت و مقام کے قائل نہیں ہیں لہٰذا وہ سرے سے اس طرح کی امامت کے حامل کسی بھی امام کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ یعنی وہ امامت کے ہی قائل نہیں ہیں، نہ یہ کہ امامت کے تو قائل ہوں اور کہیں کہ علی امام نہیں ہیں، ابوبکر اس کے اہل ہیں، نہیں بلکہ وہ لوگ ابوبکر، عمر و عثمان بلکہ کلی طور پر کسی ایک صحابی کے لئے بھی اس منصب یا مقام کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ خود اپنی کتابوں میں ابوبکر و عمر سے دینی مسائل میں ہزاروں اشتباہات اور غلطیاں نقل کرتے ہیں۔ لیکن شیعہ اپنے اماموں کو خطاؤں سے معصوم جانتے ہیں اور امام سے کسی خطا کے سرزد ہونے کو محال سمجھتے ہیں۔ (مثال کے طور پر اہل سنت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ) ابوبکر نے فلاں مقام پر اشتباہ کیا اور بعد میں خود ہی کہا کہ: "ان لی شیطانا یعترینی" "بلاشبہ ایک شیطان ہے جو اکثر میرے اوپر مسلط ہو جاتا ہے اور میں غلطیاں کر بیٹھتا ہوں"۔ یا عمر نے فلاں مقام پر خطا اور غلطی کی اور بعد میں کہا کہ: "یہ عورتیں بھی عمر سے زیادہ عالم و فاضل ہیں"۔

کہتے ہیں کہ جب ابوبکر کا انتقال ہوا تو ان کے اہل خاندان منجملہ ابوبکر کی صاحبزادی اور زوجۂ رسولؐ عائشہ بھی گریہ و آہ و زاری کرنے لگیں۔ یہ صدائے گریہ جب ابوبکر کے گھر سے بلند ہوئی تو عمر نے پیغام کہلایا کہ جا کر عورتوں سے کہدو کہ خاموش رہیں۔ وہ خاموش نہ ہوئیں۔ دوسری مرتبہ کہلایا کہ اگر خاموش نہ ہوئیں تو میں تازیانہ لے کر آتا ہوں۔ یوں ہی پیغام کے بعد پیغام جاتے رہے۔ لوگوں نے عائشہ سے کہا کہ عمر گریہ کرنے پر بگڑ رہے ہیں، دھمکیاں دے رہے ہیں اور رونے سے منع کرتے ہیں۔ آپ نے کہا ابن خطاب کو بلاؤ، دیکھیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔ عمر، عائشہ کے احترام میں خود آئے۔ عائشہ نے پوچھا کیا بات ہے، یہ بار بار پیغام کیا کہلا رہے تھے؟ کہنے لگے میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص

مرجائے اور لوگ اس پر روئیں تو جس قدر وہ گریہ کریں گے اتنا ہی مرنے والا عذاب میں گرفتار ہوتا جائے گا، لوگوں کا گریہ اس کے لئے عذاب ہے۔ عائشہ نے کہا: تم سمجھتے نہیں، تمہیں اشتباہ ہوا ہے۔ مسئلہ کچھ اور ہے، میں جانتی ہوں اصل قصہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک خبیث یہودی مرگیا تھا، اس کے اعزا اس پر رو رہے تھے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: یہ لوگ رو رہے ہیں، جبکہ اس پر عذاب ہو رہا ہے۔ یہ نہیں فرمایا تھا کہ ان لوگوں کا رونا عذاب کا سبب بن رہا ہے۔ بلکہ فرمایا تھا کہ یہ لوگ اس پر رو رہے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس پر عذاب کیا جا رہا ہے۔ آخر اس واقعہ کا اس مسئلہ سے کیا تعلق ہے؟! اس کے علاوہ اگر میت پر رونا حرام ہے تو ہم گناہ کر رہے ہیں خدا ایک بے گناہ پر عذاب کیوں کر رہا ہے؟! اس کا اس میں کیا گناہ ہے کہ گریہ ہم کریں اور عذاب میں وہ مبتلا کیا جائے؟! عمر نے کہا اچھا! بات یہ تھی؟! عائشہ نے کہا ہاں حقیقت یہی ہے اس وقت عمر نے کہا: اگر عورتیں نہ ہوتیں تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔

خود اہل سنت کہتے ہیں کہ عمر نے ستر جگہوں پر (یعنی بہت سے مقامات پر اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ایسے موارد بہت زیادہ ہیں) کہا: "لولا علی لھلک عمر" اور امیر المومنینؑ ان کی غلطیوں کو درست کرتے تھے۔ اور وہ خود بھی اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ اہل سنت اس نوعیت کی امامت کے قائل نہیں ہیں۔ اب بحث کا رخ اس مسئلہ کی طرف پلٹتا ہے کہ بلاشبہ وحی فقط پیغمبرؐ پر نازل ہوتی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ائمہ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اسلام صرف پیغمبرؐ نے عالم بشریت تک پہنچایا اور خدا نے بھی اسلام سے متعلق جو کچھ کہنا تھا پیغمبرؐ سے فرما دیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اسلام کے بعض قوانین پیغمبرؐ سے نہ کہے گئے ہوں۔ پیغمبرؐ سے سب کچھ کہہ دیا گیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے تمام احکام و قوانین عام لوگوں تک بھی پہنچا دیے گئے یا نہیں؟ اہل سنت کہتے ہیں کہ اسلام کے جتنے احکام و قوانین تھے پیغمبرؐ نے اپنے اصحاب تک پہنچا دیئے۔ لیکن بعد میں جب صحابہ سے کسی مسئلہ میں کوئی روایت نہیں ملتی تو الجھ جاتے ہیں کہ کیا کریں؟ اور یہیں سے دین میں قیاس کا مسئلہ داخل ہو جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ان مسائل کو

قانون قیاس کے ذریعہ مکمل کرلیتے ہیں۔ جس کے متعلق امیرالمومنین نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں "گویا خدا نے ناقص دین بھیجا ہے کہ تم اسے مکمل کروگے؟" لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ نہ خدا نے ناقص اسلامی قوانین پیغمبرؐ پر نازل کیے اور نہ پیغمبرؐ نے انہیں ناقص صورت میں لوگوں تک پہنچایا پیغمبرؐ نے کامل طور پر سب کچھ بیان کردیا، لیکن جو کچھ کامل شکل میں پیغمبرؐ نے بیان کیا، سب کچھ وہی نہیں ہے جو پیغمبرؐ نے عوام کے سامنے بیان کیا ہے۔ (کتنے ہی احکام ایسے تھے جن کی ضرورت پیغمبرؐ کے زمانہ میں پیش ہی نہیں آئی اور بعد میں ان کے متعلق سوال اٹھا) بلکہ آپؐ نے خدا کی جانب سے نازل ہونے والے تمام احکام اپنے شاگرد خاص کو تعلیم دے دیئے، اور ان سے فرمادیا کہ تم بعد میں ضرورت کے مطابق لوگوں سے بیان کرنا۔

یہیں سے عصمت کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ جس طرح پیغمبرؐ اپنے بیان و گفتگو میں عمداً یا سہواً غلطی یا اشتباہ سے دوچار نہیں ہوتے یوں ہی ان کا شاگرد خاص بھی خطا یا اشتباہ سے دوچار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جس طرح پیغمبرؐ کو ایک نوعیت سے تائید الٰہی حاصل تھی یوں ہی ان کے خصوصی شاگرد کو بھی غیبی و الٰہی تائید حاصل تھی اور یہ گویا امامت کا ایک اور فضل و شرف ہے۔

امامت، ولایت کے معنیٰ میں

اس تیسرے مرتبہ میں امامت اپنے اوج کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور شیعہ کتابیں اس مفہوم سے بھری پڑی ہیں۔ مزید یہ کہ امامت کی یہی حیثیت تشیع اور تصوف کے درمیان مشترک پہلو رکھتی ہے البتہ اس وجہ اشتراک کی تعبیر سے کوئی غلط مفہوم نہ لینا چاہئے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے اس سلسلہ میں مستشرقین کی باتیں آپ کے سامنے آئیں جو مسئلہ کو اسی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ عرفا کے یہاں بڑے شد و مد کے ساتھ پایا جاتا ہے اور شیعوں میں بھی صدر اسلام سے ہی موجود تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے دس سال پہلے "ہنری کاربن" نے علامہ طباطبائی سے ایک انٹرویو کے دوران یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ اس مسئلہ کو شیعوں نے متصوفہ کے یہاں سے لیا ہے یا متصوفہ نے شیعوں سے اپنایا ہے؟ گویا وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک نے دوسرے سے حاصل کیا

یہ واقعہ تقریباً ~~بیس~~ پچیس سال قبل کا ہے۔ (حاشیہ پر: ۲۰ / ۶۵)

علامہ طباطبائی نے جواب دیا تھا کہ صوفیوں نے اسے شیعوں سے لیا ہے، اس لئے کہ یہ مسئلہ شیعوں کے یہاں اس وقت سے موجود ہے جب نہ تصوف کو یہ شکل حاصل ہوئی تھی اور نہ یہ مسائل ان کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں صوفیا کے یہاں بھی یہ تصور پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اگر سوال یہ اٹھے کہ ایک نے دوسرے سے اپنایا تو یہی کہا جائے گا کہ یہ تصور شیعوں سے صوفیوں کے یہاں پہنچا ہے۔ یہ مسئلہ ایک انسان کامل کا یا دوسرے الفاظ میں حجت زمانہ کا مسئلہ ہے۔ عرفا اور صوفیا اس مسئلہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎

"پس بہ ہر دوری ولیّی قائم است"

یعنی ہر دور میں ایک ایسا انسان کامل موجود ہے جو اپنے اندر انسانیت کے تمام معنویات و کمالات رکھتا ہو۔ کوئی عہد اور کوئی زمانہ ایسے ولیٔ کامل سے خالی نہیں ہے، جسے وہ اکثر لفظ قطب سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اور ایسے ولیٔ کامل کے لئے جس میں انسانیت کامل طور پر جلوہ گر ہو یہ لوگ ایسے مدارج و مراتب کے قائل ہیں جو ہمارے افکار سے بہت بعید ہیں۔ منجملہ اس کی ایک منزلت یہ بھی ہے کہ ولی لوگوں کے ضمیروں یعنی دلوں پر تسلط رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی روح کلی ہے جو تمام ارواح کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہاں بھی مولانا روم ابراہیم ادہم کی داستان میں، جو ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، اس سلسلہ میں اشارہ کرتے ہیں۔ اصل میں وہ ان افسانوں کا ذکر اپنے مطلب کی وضاحت کے لئے کرتے ہیں ان کا مقصد تاریخ بیان کرنا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں: ابراہیم ادہم دریا کے کنارہ گئے اور ایک سوئی دریا میں ڈال دی اور پھر آپ نے اس سوئی کو واپس طلب کیا۔ مچھلیوں نے پانی سے منہ نکالا تو سب کے دہن میں ایک ایک سوئی موجود تھی۔ یہاں مولانا روم کہتے ہیں ؎

دل نگہ دارید ای بی حاصلان ؛ در حضور حضرت صاحبدلان

یہاں تک کہ فرماتے ہیں شیخ یعنی ان پیر صاحب نے ان کے افکار سے حقیقت و واقعیت معلوم کرلی

شیخ واقف گشت از اندیشہ اش ؛ شیخ چون شیر است و دلہا بیشہ اش

ہم شیعوں کے یہاں ولایت کا مسئلہ اس عامیانہ تصور کے مقابلہ میں بڑا دقیق اور عمیق مفہوم رکھتا ہے۔ ولایت کا مطلب ہے حجتِ زمان یعنی کوئی زمانہ اور کوئی عہد اس حجت سے

خالی نہیں ہے: "ولولا الحجۃ لساخت الارض باھلھا" مطلب یہ ہے کہ نہ کوئی
ایسا زمانہ گزرا اور نہ کوئی ایسا زمانہ ہوگا جب زمین کسی انسان کامل یا حجت خدا سے خالی رہے (
زمین اپنی تمام موجودات کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی) شیعہ اس انسان کامل کے لئے عظیم در
ومراتب کے قائل ہیں۔ ہم اپنی اکثر و بیشتر زیارتوں میں اس طرح کی ولایت و امامت کا اقرار
واعتراف کرتے ہیں، یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام ایسی روح کلی رکھتا ہے جو تمام ارواح کا اح
کئے ہوئے ہے۔ (ہم ان کلمات کو نہ صرف ہمیشہ پڑھتے ہیں بلکہ یہ ہمارے شیعی مسلمات واصول
جزو ہے): "اشھد انک تشھد مقامی و تسمع کلامی و ترد سلامی" (مزید کہ
یہ کلمات ان کے لئے کہتے ہیں جو مر چکے ہیں۔ البتہ ہماری نظروں میں ان کی زندگی اور موت
کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس کمال پر فائز نہ تھے اور مرنے کے
بعد ایسے ہو گئے ہیں۔ ترجمہ پر غور کریں) میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اس وقت میرے وجود کو
محسوس اور درک کر رہے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں کہہ رہا ہوں "السلام
علیک یا علی بن موسی الرضا" اسے آپ سن رہے ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں اور گواہی د
ہوں کہ میں آپ کو جو سلام کر رہا ہوں "السلام علیک" آپ اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مرا
ہیں جن کا ہمارے سوا کوئی کسی کے لئے قائل نہیں ہے۔ اہل سنت (وہابیوں کے علاوہ) ص
پیغمبر اکرمؐ کے لئے اس مرتبہ کے قائل ہیں۔ پیغمبرؐ کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے لئے اس روحی
اور روحانی مرتبہ کے قائل نہیں ہیں۔ جبکہ یہ بات ہم شیعوں کے اصول مذہب میں داخل ہے
ہم ہمیشہ اس کا اقرار کرتے رہتے ہیں۔

بنابرایں مسئلہ امامت کے تین درجے ہیں۔ اگر ہم ان تینوں درجوں کو ایک دوسرے سے
نہ کریں تو امامت سے متعلق دلائل میں ہمیشہ شبہات سے دوچار ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ شیعہ
میں بھی الگ الگ درجے ہیں۔ بعض شیعہ امامت کا مطلب وہی انسانی معاشرہ کی رہبری سمجھ
ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو اپنے بعد رہبری کے لئے معین فرما دیا تھا۔ ابوبکر و عمر و عثما
ان کی جگہ پر غلط آئے۔ یہ لوگ اسی حد تک شیعہ ہیں اور امامت کے بقیہ دونوں مرتبوں کا یا عق
نہیں رکھتے یا اس سلسلہ میں سکوت اختیار کرتے ہیں۔ بعض لوگ دوسرے مرحلہ کے بھی قا

ہیں (یعنی امام دینی مرجع ہوتا ہے) لیکن تیسرے مرحلہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ مرحوم آقا سید محمد باقر درچہ ای جو آقائے بروجردی کے استاد تھے، امامت کے اس تیسرے مرحلہ کے منکر تھے۔ لیکن شیعہ اور علمائے شیعہ کی اکثریت اس تیسرے مرحلہ کا بھی عقیدہ رکھتی ہے۔

ہمیں دراصل امامت کے موضوع پر تین مرحلوں میں بحث کرنی چاہیئے :-

۱- امامت قرآن کی روشنی میں۔

۲- امامت احادیث کی روشنی میں۔

۳- امامت عقل کی روشنی میں۔

پہلے مرحلہ میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآنی آیات اس امامت پر جسے شیعہ تسلیم کرتے ہیں دلالت کرتی ہیں یا نہیں؟ اور اگر دلالت کرتی ہیں تو کیا امام کو صرف معاشرہ کے سیاسی و اجتماعی رہبر کے معنی میں پیش کرتی ہیں یا اس کی دینی مرجعیت حتیٰ کہ معنوی و روحانی ولایت کو بھی بیان کرتی ہیں؟ اس مرحلہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم احادیث پیغمبر کا جائزہ لیں کہ حضورؐ نے امامت کے سلسلہ میں کیا بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد عقل کی روشنی میں اس مسئلہ کا تجزیہ کریں کہ عقل ان تینوں مرحلوں میں امامت کو کس حیثیت سے تسلیم کرتی ہے؟ کیا عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ معاشرہ کا رہبر ہونے کی حیثیت سے حق اہل سنت کے ساتھ ہے، اور جانشین پیغمبرؐ کو شوریٰ کے ذریعہ منتخب ہونا چاہیئے، یا پیغمبرؐ نے خود اپنا جانشین معین فرما دیا ہے؟ اس طرح امامت کی بقیہ دونوں حیثیتوں کے سلسلہ میں عقل کیا کہتی ہے۔

امامت کے بارہ میں ایک حدیث

امامت کے سلسلہ میں قرآنی آیات کے ذکر سے پہلے ایک مشہور و معروف حدیث پیش کرتا ہوں۔ اس حدیث کی روایت شیعوں نے بھی کی ہے اور اہل سنت نے بھی۔ اور جس حدیث پر شیعہ و سنی دونوں متفق ہوں، اسے معمولی نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ جب دو فریق دو الگ الگ طریقوں سے اس کی روایت کرتے ہیں تو ایک بات تقریباً یقینی ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ یا امامؑ نے یہ بات بہرحال فرمائی ہے۔ البتہ اگرچہ عبارتوں میں تھوڑا سا فرق ہے لیکن مضمون تقریباً

ایک ہی ہے۔ ہم شیعہ اس حدیث کو زیادہ تران الفاظ میں نقل کرتے ہیں : من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ[1] ''یعنی جو شخص اپنے زمانہ کے امام یا رہبر کو پہچانے بغیر مر جائے، وہ جاہلیت کی موت مرا'' حدیث کی یہ تعبیر بہت شدید ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت میں مرنے والا نہ توحید پر ایمان رکھتا تھا نہ نبوت پر بلکہ سرے سے مشرک ہوتا تھا۔ یہ حدیث شیعہ کتابوں میں کثرت سے نقل ہوئی ہے، اور شیعی اصول و مسلمات سے بھی صد فی صد مطابقت و موافقت رکھتی ہے شیعوں کی معتبر ترین حدیث کی کتاب ''کافی'' میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے۔ اہل سنت کی کتابوں میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ لیکن اسے ایک روایت میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے: ''من مات بغیر امام مات میتۃ جاھلیۃ'' جو شخص امام کے بغیر مر جائے گویا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ ایک دوسری عبارت میں اس طرح نقل ہے: ''من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ'' جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں کسی امام کی بیعت کا قلادہ نہ ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔ ایک اور عبارت جو شیعوں کے یہاں بھی ملتی ہے۔ لیکن اہل سنت کے یہاں کثرت سے نقل ہے : من مات ولا امام لہ مات میتۃ جاھلیۃ[2] ''جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس کا کوئی امام نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا) اس طرح کی عبارتیں بہت زیادہ ہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے مسئلہ امامت کے سلسلہ میں خاص اہتمام فرمایا ہے۔

جو لوگ امامت کا مطلب صرف اجتماع و معاشرہ کی رہبری سمجھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ دیکھو پیغمبر نے رہبری کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ خود معتقد ہیں اگر امت کا کوئی رہبر و پیشوا نہ ہو تو لوگوں کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ کیونکہ احکام اسلامی کی صحیح تشریح اور ان کا صحیح نفاذ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب امت میں ایک صالح رہبر موجود ہو اور امت اپنے رہبر کے ساتھ مضبوط ارتباط قائم رکھے۔ اسلام انفرادی دین نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے کہ میں خدا و رسول پر ایمان رکھتا ہوں، اب مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں۔ نہیں بلکہ خدا و رسول پر ایمان رکھنے کے بعد بھی آپ کو بہرحال یہ دیکھنا اور سمجھنا پڑے گا کہ اس زمانہ میں رہبر و امام کون ہے تاکہ

---

[1] دلائل الصدوق ص ۶ و ۱۳

[2] مسند احمد (ابن حنبل)

بہر حال اسی کی سرپرستی اور رہبری میں عملی زندگی گزاریں۔ اور جو لوگ امامت کو دینی مرجعیت کے معنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ اس حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں کہ جسے اپنا دین محفوظ رکھنا ہو اسے اپنے دینی مرجع کی معرفت حاصل کرنا ہوگی۔ اور یہ سمجھنا ہوگا کہ حقیقی دین کہاں سے حاصل کیا جائے۔ اور یہ کہ انسان دین تو رکھتا ہے لیکن وہ اپنا دین خود اس کے مخالف منابع و مراکز سے حاصل کرے تو سر سر جہالت ہوگی۔

اور جو امامت کو ولایت معنوی کی حد تک لے جاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر انسان کسی ولیّ کامل کے لطف و کرم اور اس کی توجہ کا مرکز قرار نہ پائے تو گویا اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔ یہ حدیث چونکہ متواترات سے ہے لہٰذا میں نے چاہا کہ پہلے عرض کر دوں تاکہ ذہنوں میں باقی رہے، انشاء اللہ اس پر آئندہ بحث کی جائے گی۔

امامت قرآن کی روشنی میں

قرآن کریم میں کئی آیتیں مذکور ہیں جن سے شیعہ امامت کے سلسلہ میں استدلال کرتے ہیں اتفاق سے ان تمام آیتوں کے سلسلہ میں اہل سنت کے یہاں بھی ایسی روایتیں موجود ہیں جو شیعہ مطالب کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے: انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکاۃ وھم راکعون۔

"انما" کے معنی ہیں صرف اور صرف (کیونکہ یہ اداۃ حصر ہے)، "ولیّ" کے اصل معنی ہیں سرپرست ولایت یعنی تسلط و سرپرستی۔ قرآن کہتا ہے۔ "تمہارا سرپرست صرف اور صرف خدا ہے، اس کا رسول ہے اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔" اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ انسان حالت رکوع میں زکوٰۃ دے۔ تاکہ کہا جائے کہ یہ قانون کلی ہے اور تمام افراد اس حکم میں شامل ہیں۔ یہ ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو خارج میں صرف ایک بار ظہور پذیر ہوا۔ شیعہ اور سنی دونوں نے متفق طور پر اس کی روایت کی ہے۔ واقعہ

سورۂ مائدہ / آیت نمبر ۵۵

کا خلاصہ یوں ہے کہ حضرت علیؑ حالت رکوع میں تھے کہ ایک سائل نے آکر سوال کیا۔ حضرتؑ نے اپنی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا۔ سائل قریب آیا، اس نے حضرت علیؑ کی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور لیکر چلا گیا۔ یعنی آپ نے اتنا انتظار بھی نہیں کیا کہ نماز تمام ہو جائے اس کے بعد انفاق کریں۔ آپ اس فقیر کے سوال کو جلد از جلد پورا کرنا چاہتے تھے لہٰذا اسی رکوع کی حالت میں اسے اشارہ سے سمجھا دیا کہ انگوٹھی اتار لے جائے اور اسے بیچ کر اپنا خرچ پورا کرے۔ اس واقعہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے سنی شیعہ سب متفق ہیں کہ حضرت علیؑ نے یہ عمل انجام دیا ہے۔ دونوں فریق اس بات پر بھی متفق ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ جبکہ رکوع کی حالت میں انفاق کرنا اسلامی قوانین کا جزو نہیں ہے۔ نہ واجب ہے نہ مستحب کہ یہ کہا جائے کہ ممکن ہے کچھ لوگوں نے اس قانون پر عمل کیا ہو۔ لہٰذا آیت کا یہ انداز "جو لوگ یہ عمل انجام دیتے ہیں" ایک اشارہ و کنایہ ہے۔ جیسے خود قرآن میں اکثر آیا ہے "یقولون" یعنی (وہ لوگ یہ کہتے ہیں) جبکہ معلوم ہے کہ ایک شخص نے یہ بات کہی ہے۔ لہٰذا یہاں اس مفہوم سے مراد وہ فرد ہے جس نے یہ عمل انجام دیا ہے۔ بنابر ایں اس آیت کے حکم کے مطابق حضرت علیؑ لوگوں پر ولی کی حیثیت سے معین کئے گئے ہیں۔ چنانچہ شیعہ اس آیت کو استدلال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ البتہ اس پر اس سے کہیں زیادہ بحث و گفتگو ہونی چاہئے جسے ہم آئندہ پیش کریں گے۔

دوسری آیات واقعۂ غدیر سے متعلق ہیں۔ اگرچہ خود واقعہ غدیر احادیث کے ذیل میں آتا ہے اور ہم اس پر بعد میں بحث کریں گے۔ لیکن اس واقعہ سے متعلق سورۂ مائدہ میں جو آیتیں وارد ہوئی ہیں۔ ان میں ایک آیت یہ ہے: "یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ"٭ (یہاں لہجہ بہت تند ہو گیا ہے) اے پیغمبرؐ! جو کچھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کر دو، اور اگر تم نے اس کی تبلیغ نہیں کی تو گویا تم نے سرے سے رسالت الٰہی کی تبلیغ نہیں کی۔ اس آیت کا مفہوم اتنا ہی شدید اور تند ہے جتنا حدیث "من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ" کا اجمالی طور سے خود یہ آیت ظاہر کر دیتی ہے کہ موضوع اتنا اہم ہے کہ اگر پیغمبرؐ نے اس کی تبلیغ نہ کی تو

٭ سورہ مائدہ/ آیت نمبر ۶۷

گویا کار رسالت ہی انجام نہیں دیا۔

شیعہ و سنی دونوں اس پر متفق ہیں کہ پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی آخری سورہ، سورۂ مائدہ ہے۔ اور یہ آیتیں ان آیتوں کا جزو ہیں جو سب سے آخر میں پیغمبرؐ پر نازل ہوئیں۔ یعنی اس وقت نازل ہوئیں جب پیغمبر اسلامؐ تیرہؐ سال، مکہ کی زندگی اور دس سال مدینہ کی حیات میں اسلام کے تمام دوسرے قوانین و احکام بیان کر چکے تھے یہ حکم ان احکام کا آخر جزو تھا۔ اب ایک شیعہ سوال کرتا ہے کہ یہ حکم جو آخری احکام کا جزو ہے اور اس قدر اہم ہے کہ اگر پیغمبرؐ اسے نہ پہنچائیں تو ان کی گزشتہ تمام محنتوں پر پانی پھر جائے، آخر ہے کونسا حکم؟ آپ لاکھ تلاش کے بعد کسی ایسے مسئلہ کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں سے مربوط ہو اور اس قدر اہم ہو کہ اگر حضورؐ اس کی تبلیغ نہ کریں تو گویا انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ مسئلہ امامت ہے۔ اگر وہ نہ ہو تا سب کچھ بیکار ہے۔ یعنی اسلام کا شیرازہ بکھر کے رہ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ شیعہ خود اہل سنت کی روایات سے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم میں نازل ہوئی ہے۔

اسی سورۂ مائدہ میں ایک اور آیت ہے: الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (مائدہ/۳) "آج میں نے دین کو تم لوگوں کے لئے کمال کی منزلوں تک پہنچا دیا۔ اس پر اپنی نعمتیں آخری حد تک تمام کر دیں اور آج کے دن میں نے اسلام کو ایک دین کے عنوان سے تمہارے لئے پسندیدہ قرار دیا۔" خود آیت ظاہر کر رہی ہے کہ اس دن کوئی واقعہ گزرا ہے جو اتنا اہم ہے کہ دین کے کامل ہونے اور نعمت پروردگار کی طرف سے اتمام نعمت کا سبب بن گیا ہے۔ جس کے ظہور پذیر ہونے سے اسلام درحقیقت اسلام ہے اور خدا اس دین کو ویسا ہی پاتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے اور اگر وہ نہ ہو تو اسلام اسلام ہی نہیں ہے۔ آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ یہ واقعہ کتنا اہم ہے۔ اسی بنا پر شیعہ اس سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ موضوع جو دین کی تکمیل اور اتمام نعمت کا سبب بنا اور جو اگر واقع نہ ہوتا تو اسلام دراصل اسلام ہی نہ رہتا۔ وہ کیا تھا؟ شیعہ کہتے ہیں کہ ہم ہی بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا موضوع ہے جسے اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی روایتیں اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ یہ آیت بھی اسی موضوع امامت کے تحت نازل ہوئی ہے۔

گزشتہ بحث میں امامت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ ان مختلف پہلوؤں کو کامل طور پر مشخص ہونا چاہیئے۔ جب تک امامت کے تمام پہلو مشخص و معین نہ ہوں گے، ہم اس مسئلہ پر بخوبی بحث نہیں کر سکتے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ امامت میں ایک مسئلہ حکومت بھی ہے۔ یعنی پیغمبر اسلام کے بعد حکومت کیسی ہونی چاہیئے؟ کیا حکومت کی تعیین خود مسلمانوں کے ذمہ ہے اور عوام کا فریضہ ہے کہ اپنے درمیان کسی کو اپنا حاکم معین کریں یا پیغمبرؐ نے اپنے بعد کے لئے اپنا نائب اور حاکم معین کر دیا ہے؟

ان دنوں اس مسئلہ کو کچھ اس ڈھنگ سے پیش کیا جانے لگا ہے کہ فطری طور سے ذہن پہلے اہل سنت کے نظریہ کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ ان کا نظریہ فطرت سے زیادہ قریب ہے۔

غلط روش

یہ مطلب کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اصل میں ہمیں ایک حکومت کا مسئلہ درپیش ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کیسی ہونی چاہیئے؟ کیا حکومت موروثی اور تعینی ہے کہ ہر حاکم اپنے بعد کے لئے ایک حاکم معین کر دے اور عوام کو حکومت کے معاملات میں کسی طرح کی دخل اندازی کا حق حاصل نہ ہو؟ پیغمبرؐ نے ایک شخص کو معین فرمایا پھر اس شخص نے اپنے بعد کے لئے کسی تیسرے کو معین کیا۔ اور صبح قیامت تک حکومت کی یہی صورت رہی کہ ہمیشہ نص و تعیین کا

دوسری بحث

امامت اور تبلیغ دین

سلسلہ چلتا رہا، اب قہری طور پر یہ امر صرف ائمہ تک مخصوص و محدود نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ائمہ معصومینؑ صرف بارہ ہیں اور شیعہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تعداد نہ کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ۔ اس فکر کے مطابق حکومت کے سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے قانون کلی یہ ہو گا کہ پیغمبرؐ جو خود حاکم ہے اپنے بعد اپنا نائب معین کرے اور وہ اپنے بعد کسی دوسرے کو حاکم مقرر کر دے اور یوں ہی یہ سلسلہ صبح قیامت تک چلتا رہے۔ چنانچہ اگر اسلام پوری دنیا پر حاکم ہو جائے (جیسا کہ آج تقریباً آدھی دنیا اس کے زیر نگیں ہے اور تقریباً ایک ارب مسلمان پرچم اسلام کے سایہ میں زندگی گزار رہے ہیں) اور یہ طے پائے کہ دنیا کے کونے کونے میں اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں، چاہے ایک عالمی حکومت کی شکل میں یا چند چھوٹی بڑی حکومتوں کی صورت میں قانون یہی تعیینی ہے۔ پس یہ جو ہم کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو معین فرمایا تو تعیین بھی اسی کلی قانون کے تحت تھی کہ حکومت تعیینی و تنصیصی ہونی چاہیئے"۔ اور اس فلسفہ کے تحت اس کی ضرورت بھی نہیں رہ جاتی کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو خدا کی جانب سے معین فرمایا ہو۔ کیونکہ پیغمبرؐ تو وحی کے ذریعہ احکام خدا بیان کر سکتے تھے اور ائمہ معصومین پر بھی ایک تو الہام ہوتا ہے دوسرے انہوں نے خود پیغمبرؐ سے علوم اخذ کئے ہیں، لیکن ان کے بعد تو ایسا نہیں ہے! بس اگر حکومت کے سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی قانون (کہ حکومت تنصیصی تعیینی ہونی چاہیئے) تو اس کی ضرورت نہیں کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو وحی کے ذریعہ معین فرمایا ہو بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرتؐ نے خود اپنی صوابدید پر معین فرمایا ہے۔ اسی طرح ائمہؑ نے

اپنے مصالح کے مطابق اپنے جانشین معین فرمائے ہیں۔ بنابرایں پیغمبرؐ کی نظر میں خلافت کے لئے علیؑ کی تعیین ویسی ہی ہے جیسے آپ نے کسی کو مکہ کا حاکم یا حاجیوں کے لئے امیر الحاج معین فرمایا ہو، جس طرح وہاں کوئی یہ نہیں کہتا کہ اگر پیغمبرؐ نے فلاں شخص کو مکہ کا حاکم بنایا۔ یا معاذ بن جبل کو تبلیغ کے لئے یمن بھیجا، تو یہ سب وحی کے حکم سے تھا، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ پیغمبرؐ خداوند عالم کی جانب سے لوگوں پر حاکم و سرپرست ہیں لہٰذا جن مسائل میں ان پر وحی نہیں نازل ہوتی، ان میں ذاتی تدبر و فراست سے اقدام فرماتے ہیں (یوں ہی یہاں بھی کہا جائے گا کہ پیغمبرؐ نے خود اپنی ذاتی تشخیص و تدبر سے علیؑ کو خلافت و نیابت کے لئے معین فرمایا)

اگر ہم مسئلہ امامت کو اتنی ہی سادگی سے پیش کریں کہ یہ دنیاوی حکومت کا مسئلہ بن جائے تو

اس کے علاوہ ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس امامت سے الگ ہے جس پر بحث کی جا رہی ہے۔ کیونکہ اگر مسئلہ اسی شکل میں ہوتا تو میں عرض کر چکا ہوں کہ اس میں وحی کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں وحی کو اسی قدر دخل ہوتا کہ: اے پیغمبرؐ! تمہارا فرض ہے کہ اپنی مصلحت کے مطابق جسے چاہو اپنا جانشین معین کر دو، اور وہ جسے بہتر سمجھے اپنا جانشین بنائے، تا صبح قیامت! اگر ہم امامت کو اتنے ہی سادہ طور سے حکومت کی سطح پر پیش کریں اور کہیں کہ امامت کا مطلب حکومت ہے تو ایسی صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ شیعی نقطۂ نظر کے مقابلہ میں اہل سنت کا نظریہ زیادہ پر کشش نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ایک حاکم کو اپنے بعد حاکم معین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ یہ حق امت اور ارباب حل و عقد کو حاصل ہے۔ عوام اس کے حقدار ہیں، حاکم کا انتخاب ڈیموکریسی کے اصولوں پر ہونا چاہیئے۔ یہ حق عوام کا ہے لہٰذا عوام ہی حاکم منتخب کریں گے۔ لیکن حقیقتاً مسئلہ اتنا سادہ اور ہلکا پھلکا نہیں ہے۔ مجموعی طور سے شیعوں کے یہاں علیؑ اور تمام ائمہ معصومینؑ کی خلافت کا مسئلہ تنصیصی تعیینی ہے۔ اس کا مدار ایک دوسرے مسئلہ پر ہے اور وہ مسئلہ اس سے بھی زیادہ بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔

.. یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی تعداد فقط بارہ افراد پر مشتمل ہے، پھر ان ائمہؑ کے بعد حکومت کی صورت کیا ہوگی؟ ہم فرض کر لیں کہ جس طرح پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ کو حاکم معین فرمایا، آپ کے بعد امام حسنؑ پھر امام حسینؑ حاکم ہوئے اور یہ سلسلہ حضرت حجتؑ تک جاری رہتا ہے۔ ایسی صورت میں قہری طور پر اس نقطۂ نظر کے مطابق جو ہم شیعہ اس سلسلہ میں رکھتے ہیں۔ امام زمانہؑ کی غیبت کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ حضرت بھی اپنے آبائے کرام کی طرح ایک مختصر سی زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ اس کے بعد کیا ہوتا؟ کیا ائمہؑ کی تعداد بارہ سے بڑھ جاتی؟ نہیں لہٰذا کوئی دوسری صورت عوام کے سامنے ہونی چاہیئے، ایک عادی صورت بالکل ویسی ہی جیسے آج بھی موجود ہے۔ حضرت حجتؑ غیبت کے زمانہ میں تو مسلمانوں کے حاکم ہو نہیں سکتے۔ لہٰذا دنیاوی حکومت کا مسئلہ اپنی جگہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے!

حکومت، امامت کی ایک فرع

ہمیں ہرگز اس اشتباہ اور مغالطہ میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ جہاں کہیں شیعوں کے نزدیک

امامت کا مسئلہ در پیش ہو اسے حکومت کا مسئلہ قرار دیں۔ نتیجہ میں یہ مسئلہ بہت ہی معمولی صورت اختیار کر لے اور صرف ایک فرعی حیثیت رہ جائے اور یہ کہا جائے کہ اب جبکہ حکومت اور حاکم کا مسئلہ در پیش ہے تو کیا حاکم کو سب سے افضل ہی ہونا چاہیئے؟ ممکن ہے جو شخص حاکم ہو وہ نسبی طور سے تو افضل ہو واقعی افضل نہ ہو؟ یعنی سیاست اور نظم و تدبیر میں تو دوسروں سے بہتر ہو لیکن دوسرے اعتبارات سے بہت ہی پست ہو۔ ایک اچھا سیاست داں اور منتظم ہو خائن بھی نہ ہو لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ معصوم بھی ہو؟ کیا ضروری ہے کہ نماز شب پڑھتا ہے یا نہیں؟ فقہی مسائل جانتا ہے یا نہیں؟ کیا ضروری ہے کہ جانے؟ ان مسائل میں وہ دوسروں سے معلومات حاصل کر لیتا ہے، فقط ایک نسبی و اعتباری افضلیت اس کیلئے کافی ہے۔ یہ تمام باتیں اس کا نتیجہ ہیں کہ ہم نے مسئلہ امامت کو فقط حکومت کی سطح پر دیکھا اور معمولی قرار دیدیا یہ بہت بڑا مغالطہ ہے اور ایسا مغالطہ ہے جس میں بعض قدیم (علماء علم کلام) بھی مبتلا ہو چکے ہیں۔ آج اسی مغالطہ کو بار بار دہرایا جاتا ہے اور ہوا دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب بھی امامت کا ذکر آتا ہے اس سے حکومت مراد لی جاتی ہے۔ جبکہ حکومت مسئلہ امامت کی ایک چھوٹی سی شاخ اور معمولی فرع کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دونوں کو آپس میں مخلوط نہیں کرنا چاہیئے۔ پھر امامت کیا ہے؟

امام دین بیان کرنے میں پیغمبرؐ کا جانشین

امامت کے سلسلہ میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ امام دین کی تشریح اور اسے بیان کرنے میں پیغمبرؐ کا جانشین ہے، فرق صرف یہ ہے کہ امام پر وحی نہیں نازل ہوتی۔ بلاشبہ وحی صرف پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوتی تھی اور ان کی رحلت کے بعد وحی و رسالت کا سلسلہ قطعی طور پر بند ہو گیا۔ امامت کا مسئلہ یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلامؐ کے بعد وہ تمام آسمانی تعلیمات جس میں نہ اجتہاد کو دخل ہے نہ شخصی رائے کو، ان کا بیان یا تشریح و تبلیغ کسی ایک ہی فرد تک محدود ہے؟ اور اس طرح جیسے پیغمبر کی شان تھی کہ جب لوگ ان سے دینی مسائل دریافت کرتے تھے وہ یہ جانتے تھے کہ ان کا قول حق و حقیقت پر مبنی ہے۔ اس میں شخصی فکر یا رائے کو دخل نہیں ہے جس میں اشتباہ یا غلطی کا امکان ہو اور دوسرے روز وہ اپنی بات کی تصحیح فرمائیں۔ ہم پیغمبرؐ کے بارے میں ہرگز یہ بات نہیں کہتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں ہماری نظر میں ان کا فلاں جواب درست نہیں ہے اور یہاں پر آپ جان بوجھ کر خواہشات نفسانی

سے متاثر ہو گئے ہیں کیونکہ یہ باتیں عقیدۂ نبوت کے خلاف ہیں۔ اگر قطعی دلائل سے ثابت ہو جائے کہ یہ جملہ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے، تو ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا تو ہے لیکن اس میں ان سے اشتباہ ہو گیا ہے۔ ایک مرجع تقلید کے لئے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ اس نے فلاں سوال کے جواب میں اشتباہ اور غفلت کی یا جیسا کہ اور سب کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ حالات سے متاثر ہو گئے لیکن پیغمبرؐ کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ یوں سمجھئے کہ جس طرح ہم قرآن کی آیت کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں وحی نے اشتباہ کیا ہے یا نفسانی خواہشات اور بے انصافی سے کام لیا ہے، وحی کے اشتباہ کا مطلب یہ ہوا کہ یہ آیت وحی نہیں ہے (اسی طرح پیغمبرؐ کے اقوال کے لئے بھی یہ سب نہیں کہہ سکتے)

اب سوال یہ ہے کہ کیا پیغمبرؐ کے بعد بھی کوئی ایسا شخص موجود تھا جو احکام دین کی تشریح و تفسیر کے لئے پیغمبرؐ ہی کے مانند مرکزی حیثیت کا حامل ہو؟ ایک انسان کامل ان خصوصیات کا حامل موجود تھا یا نہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ ایسا شخص موجود تھا (اور وہ علیؑ اور ان کے بعد ائمہ معصومینؑ تھے) بس فرق یہ ہے کہ پیغمبرؐ براہ راست وحی کے ذریعہ دینی احکام بیان فرماتے ہیں اور ائمہ جو کچھ فرماتے ہیں پیغمبرؐ سے اخذ کر کے فرماتے ہیں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ پیغمبرؐ نے ان کو یہ باتیں تعلیم کی ہیں بلکہ اس شکل میں کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں پیغمبر اسلامؐ نے میرے لئے علم کا ایک باب کھولا۔ اسی باب کے ذریعہ مجھ پر علم کے ہزار باب کھل گئے۔ ہم اس کی وضاحت نہیں کر سکتے کہ ایسا کیسے ہوا۔ جس طرح وحی کے لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پیغمبر اسلامؐ خدا کی طرف سے کیسے علم حاصل کرتے تھے۔ یوں ہی ہم اس کی وضاحت بھی نہیں کر سکتے کہ پیغمبر اکرمؐ اور حضرت علیؑ کے درمیان کس نوعیت کا معنوی و روحانی رابطہ تھا کہ پیغمبر اسلام نے تمام حقائق و معارف کما هو حقه و بتمامه، جو اس کا حق تھا کامل طور پر حضرت علیؑ کو تعلیم فرما دیئے اور آپ کے علاوہ کسی سے بیان نہ فرمائے۔ حضرت علیؑ خود نہج البلاغہ میں (اس طرح کی عبارتیں دوسری جگہوں پر بھی بہت ہیں) فرماتے ہیں کہ: میں پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ غار حرا میں تھا، (اس وقت آپ کمسن تھے) کہ میں نے ایک دردناک گریہ کی آواز سنی، عرض کیا یا رسول اللہ، جب آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی میں نے شیطان کے رونے کی آواز سنی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: یا علی! انك تسمع ما اسمع و تری ما اری ولکنك لست بنبی[1] "اے علیؑ! جو کچھ میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو اور جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۹۲

دیکھتے ہو ، بس فرق یہ ہے کہ تم نبی نہیں ہو) اگر وہیں حضرت علیؑ کے پاس کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہوتا تو وہ آواز نہیں سن سکتا تھا ۔ کیونکہ یہ سماعت فضا میں گردش کرنے والی عام آواز کے سننے والی سماعت نہیں تھی جسے ہر صاحب گوش سن سکتا ۔ بلکہ یہ سماعت ، بصارت اور احساس کچھ اور ہی ہے ۔

حدیث ثقلین اور عصمت ائمہ علیہم السلام

مسئلہ امامت کی بنیاد اس کا یہی معنوی پہلو ہے ۔ ائمہ یعنی پیغمبر کے بعد ایسے معنوی انسان ، جو انھیں معنوی طریقوں سے اسلام کی معرفت رکھتے ہیں اور اسے پہچانتے ہیں اور پیغمبرؐ ہی کے مانند خطاؤں ، لغزشوں اور گناہوں سے محفوظ و معصوم ہیں ۔ امام ایک ایسے قطعی و یقینی مرجع و مرکز کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر اس سے کوئی بات سنی جائے تو اس میں نہ تو کسی خطا یا لغزش کا احتمال دیا جا سکتا ہے ۔ نہ ہی اس سے جان بوجھ کر انحراف ہو سکتا ہے ۔ اور اس کو دوسرے الفاظ میں عصمت کہتے ہیں ۔ یہی وہ منزل ہے جہاں شیعہ کہتے ہیں کہ پیغمبر گرامی کا ارشاد : "انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی[1] " (میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک قرآن ہے اور دوسرے میری عترت) مسئلہ عصمت میں نص کی حیثیت رکھتی ہے ۔

اور جہاں تک یہ سوال ہے کہ آیا پیغمبر نے یہ بات کہی یا نہیں ؟ تو کوئی شخص پیغمبرؐ کی اس حدیث سے انکار نہیں کر سکتا ۔ یہ ایسی حدیث نہیں ہے جسے صرف شیعوں نے نقل کیا ہو ، بلکہ شیعوں سے زیادہ اہل سنت نے اس کی روایت کی ہے ۔ میری قم کی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا ۔ اس وقت دار التقریب (مصر) کی طرف سے " رسالۃ الاسلام " کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوتا تھا ۔ اس میں ایک اہل سنت عالم نے اپنے مقالہ میں اس حدیث کو یوں نقل کیا تھا : انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وسنتی ۔ مرحوم آیت اللہ بروجردی ، جو واقعاً تمام معنی میں عالم و روحانی تھے اور ان مسائل میں عاقلانہ فکر اور گہری بصیرت رکھتے تھے ۔ آپ نے ایک فاضل طالب علم آقای شیخ قوام الدین وشنوہ ای کی راہنمائی اس امر کی طرف فرمائی کہ مذکورہ حدیث کو اہل سنت کی کتابوں سے نقل کریں ۔ یہ بزرگ بھی کتابوں پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ انہوں نے اہل سنت کی تقریباً دو سو سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد کتابوں سے اس حدیث کو ان ہی لفظوں میں نقل فرمایا ؛ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ

[1] صحیح مسلم جزء ہفتم ص ۱۲۲

وعترتی" یہ حدیث متعدد مقامات پر نقل ہوئی ہے ۔ کیونکہ پیغمبرؐ نے اسے مختلف موقعوں اور متعدد جگہوں پر انھیں الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔ البتہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک مرتبہ بھی یہ نہ فرمایا ہوگا کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں "کتاب وسنت" کیونکہ کتاب و عترت" اور "کتاب سنت" میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے ۔ اس لئے کہ عترت ہی سنّت کو بیان کرنے والی اور اس کی وضاحت کرنے والی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ ہم سنت و عترت میں سے کسی کی طرف رجوع کریں، یعنی ایک طرف پیغمبرؐ کی ایک سنّت (حدیث) ہو اور ایک طرف عترت کی ایک فرد موجود ہو تو اس صورت میں کسے انتخاب کریں! بلکہ بات یہ ہے کہ عترت ہی سنّت پیغمبرؐ کی صحیح اور واقعی وضاحت کرنے والی ہے اور پیغمبرؐ کی تمام سنتیں ان ہی کے پاس محفوظ ہیں ۔ "کتاب اللہ وعترتی" کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سنت کو ہماری عترت سے حاصل کرو ۔ اس کے علاوہ خود یہ حدیث "انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی" سنّت ہے یعنی حدیث پیغمبرؐ ہے ۔ لہٰذا ان دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے ۔ پھر بھی اگر کسی ایک جگہ وہ بھی غیر قطعی طور پر، پیغمبرؐ نے "کتاب اللہ و سنتی" فرمایا، ہو تو بہت سی جگہوں پر قطعی طور سے "کتاب اللہ وعترتی" فرمایا ہے ۔ اگر کسی ایک کتاب میں حدیث اس شکل میں ذکر ہوئی ہے، تو کم از کم دو سو کتابوں میں یہ حدیث "کتاب اللہ وعترتی" کے ساتھ ذکر ہوئی ہے ۔

بہرحال شیخ قوام الدین وشنوہ ای نے وہ تمام حوالے ایک رسالہ کی شکل میں تحریر فرمائے اور اسے "دار التقریب مصر" بھیجا ۔ ادارہ دار التقریب نے بھی اسے بے کم وکاست چھاپ دیا کیونکہ اسے کسی طرح رد نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ اب اگر مرحوم آیت اللہ بروجردی بھی دوسروں کی طرح صرف شور وغوغا اور فریاد بلند کرتے اور فرماتے کہ یہ لوگ غلط اور بکواس کرتے ہیں ۔ حق اہل بیت سے کھیلنا چاہتے ہیں، ہمیشہ بدنیتی سے کام لیتے ہیں ......؟!

اب دیکھیں کہ امامت کی اصل روح کیا ہے، اسلام جو ایک جامع، وسیع وہمہ گیر اور کلی دین ہے، کیا اسی قدر ہے جتنا قرآن میں اصول وکلیات کے طور پر بیان ہوا ہے یا پیغمبر اکرمؐ کے کلمات میں جنھیں خود اہل سنّت نے بھی نقل کیا ہے، اس کی توضیح وتفسیر بیان ہوئی ہے؟ کیا جو کچھ تھا بھی اسلام تھا؟ یقیناً اسلام کا نزول پیغمبرؐ پر تمام ہو چکا لیکن جو کچھ بیان ہوا کیا یہی کامل اسلام تھا؟ (یعنی تمام نازل شدہ اسلام بیان بھی ہو چکا؟) یا آنحضرتؐ کے بعد بھی پیغمبرؐ پر نازل شدہ

اسلام کی بہت سی باتیں ابھی اس لئے بیان سے باقی رہ گئی تھیں کہ ابھی ان کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی اور زمانہ کے ساتھ رفتہ رفتہ جب حالات و مسائل پیش آتے تو بیان نہ شدہ مسائل بیان کئے جاتے۔ چنانچہ یہ ساری دینی امانتیں حضرت علیؑ کے پاس محفوظ تھیں اور ان کے اوپر انھیں عوام کے سامنے بیان کرنے کی ذمہ داری تھی۔ یہی امامت کی روح اور اصل حقیقت ہے۔ ایسی صورت میں یہی حدیث "کتاب اللہ وعترتی" ائمہؑ کی عصمت کو بھی بیان کرتی ہے۔ کیونکہ پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں: "دین ان ہی دونوں سے حاصل کرو۔ جس طرح قرآن معصوم ہے اور اس میں کسی خطا کا امکان نہیں ہے یوں ہی عترت بھی معصوم ہے۔ اور یہ محال ہے کہ پیغمبرؐ پوری قاطعیت اور یقین کے ساتھ فرمائیں کہ دین فلاں شخص سے حاصل کرو، جبکہ وہ شخص جس کے لئے آنحضرت فرمائیں، بعض مواقع پر اشتباہ و غلطیاں بھی کرتا ہو!

یہی وہ نقطہ ہے جہاں دین کے اخذ اور بیان کرنے میں شیعہ اور سنّی نظریات میں بنیادی فرق نظر آتا ہے۔ اہل سنّت یہ کہتے ہیں کہ: جہاں پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہوا وہیں دین کے واقعی اور حقیقی بیان کا وہ عصمتی سلسلہ بھی جس میں کسی قسم کی خطا یا اشتباہ کا امکان نہ تھا، تمام ہو گیا۔ اب جو کچھ ہم تک قرآن و احادیث پیغمبر اسلام کی شکل میں پہنچا اور ہم نے اس سے استنباط کیا۔ وہی سب کچھ ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

حدیثیں نہ لکھی جائیں

ان لوگوں نے خود ایسے حالات پیدا کر دیئے جنھوں نے ان کے نظریہ کو کمزور بنا دیا۔ اور وہ یہ ہے کہ عمر نے پیغمبرؐ کی حدیثیں لکھنے پر روک لگا دی اور حکم دیا کہ حدیثیں نہ لکھی جائیں۔ اور یہ ایک تاریخی واقعیت ہے۔ اگر ہم بد بینی کے الزام سے بچنے کی غرض سے ایک شیعہ کی حیثیت سے بات نہ کریں اور اپنی جگہ ایک یورپی مستشرق کا خیال پیش کریں۔ تو وہ بھی اگر بہت زیادہ خوش بینی سے کام لے گا تو یہی کہے گا کہ عمر نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ وہ صرف قرآن کو دینی احکام کا واحد منبع و مرجع بنانے پر بے انتہا زور دیتے تھے اور اگر لوگ حدیثوں کی طرف زیادہ مائل ہو جاتے تو قرآن سے ان کا رابطہ کم ہو جاتا۔ اسی لئے انھوں نے حدیثیں لکھنے سے منع کر دیا۔ یہ واقعہ تاریخ کے

قطعیات میں سے ہے، صرف شیعوں کی کہی ہوئی بات نہیں۔ عمر کے زمانہ میں لوگ نہ حدیث پیغمبرؐ لکھنے کی جرأت کرتے تھے اور نہ یہ کہتے تھے کہ یہ پیغمبرؐ کی حدیث ہے۔ حتیٰ یہ کہ پیغمبرؐ سے حدیث کی روایت بھی نہیں کر سکتے تھے (البتہ حدیث بیان کرنا منع نہ تھا)۔ یہاں تک کہ عمر ابن عبد العزیز (سنہ ۹۹ تا سنہ ۱۰۱) نے یہ جمود توڑا اور حکم دیا کہ حدیثیں لکھی جائیں۔ اب جبکہ عمر ابن عبد العزیز نے عمر ابن خطاب کی سیرت پر خط نسخ کھینچ دیا اور کہا کہ پیغمبرؐ کی حدیثیں ضرور لکھی جائیں تو وہ افراد جنھوں نے سینہ بہ سینہ احادیث پیغمبرؐ سے کچھ محفوظ کر رکھا تھا، آئے، روایت کی اور انھیں نوشتوں کی شکل میں محفوظ کر لیا گیا بہرحال احادیث رقم کرنے سے لوگوں کو مدت تک روک دیئے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ایک بڑا حصہ تلف ہوگیا۔

سب جانتے ہیں کہ قرآن میں جو احکام بیان ہوئے ہیں بہت ہی مجمل، مختصر اور جزئی ہیں۔ قرآن سراسر کلی احکام کا مجموعہ ہے۔ مثلاً قرآن جو نماز پر اس قدر زور دیتا ہے، اس میں اس عبادت کے لئے "اقیموا الصلوٰۃ" اور "اسجدوا وارکعوا" یعنی نماز قائم کرو یا سجدہ کرو اور رکوع کرو، سے زیادہ کچھ اور نہیں آیا ہے۔ حتیٰ اس کی بھی وضاحت نہیں کی گئی کہ نماز کس انداز میں پڑھی جائے گی۔ اسی طرح حج جس کے بارے میں اتنے سارے احکام بیان کئے ہیں۔ اور پیغمبرؐ خود بھی ان احکام کے پابند تھے لیکن قرآن میں ان سے متعلق کوئی چیز بیان نہیں کی گئی ہے۔ دوسری طرف سنت پیغمبرؐ یعنی حدیثوں کا جو حال ہوا اسے ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور فرض کریں اگر یہ صورت حال پیدا نہ بھی ہوئی ہوتی، پھر بھی پیغمبرؐ کو اتنا موقع کہاں ملا کہ تمام حلال و حرام کو بیان فرما دیتے۔ مکہ کی وہ تیرہ سالہ زندگی، جس میں لوگ شدید دباؤ اور سختیوں کے باوجود مسلمان ہوئے تھے شاید ان کی تعداد چار سو افراد تک بھی نہیں پہنچتی۔ ایسے سخت حالات میں آنحضرتؐ سے ملاقات بھی ڈھکے چھپے ہوا کرتی تھی۔ ان میں سے بھی ستر خانوادوں پر مشتمل مسلمانوں کا ایک گروہ جو مسلمانوں کی نصف جمعیت یا اس سے بھی زیادہ تھے، حبشہ ہجرت کر گیا۔ ہاں مدینہ اس حیثیت سے امن کی جگہ تھی لیکن وہاں بھی پیغمبرؐ کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اگر رسول اکرمؐ اس پورے تیئیس سال کے عرصہ میں صرف ایک معلم کی حیثیت سے لوگوں کو مدرسہ کی صورت میں جمع کر کے صرف احکام تعلیم فرمایا کرتے پھر بھی اسلام کے نازل شدہ تمام احکام بیان کرنے کے لئے وقت کافی نہ ہوتا چہ جائیکہ ان حالات میں خصوصاً جبکہ اسلام انسانی زندگی کے ہر موڑ اور ہر پہلو پر ایک حکم رکھتا ہے۔

قیاس کی پناہ میں

نتیجہ یہ ہوا کہ اہل سنت اپنے مفروضہ کے مطابق عملی طور پر احکام اسلام کی تنگ دستی کا احساس کرنے لگے۔ جب مسئلہ پیش آتا، اور دیکھتے تھے کہ قرآن میں اس سے متعلق کوئی حکم بیان نہیں ہوا ہے، تو (باقی ماندہ محفوظ) حدیثوں میں حل تلاش کرتے تھے، جب وہاں بھی مایوسی ہوتی تھی تو ظاہر ہے مسئلہ بغیر کسی حکم کے چھوڑا نہیں جا سکتا، لہٰذا کسی نہ کسی طرح مسئلہ کا حکم تلاش کرنے کیلئے قیاس کا سہارا لیتے تھے، "قیاس"، یعنی جن مسائل کا حکم قرآن یا حدیث میں موجود ہے ان سے مشابہت کی بنیاد پر پیش نظر مسئلہ کا حکم بھی یوں بیان کیا جائے کہ فلاں جگہ قرآن یا حدیث میں یہ حکم بیان ہوا ہے، اور چونکہ یہ مسئلہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہے۔ اسی طرح مثلاً فلاں جگہ آنحضرتؐ نے جو فلاں حکم دیا ہے شاید اس کی علت اور فلسفہ یہ رہا ہو اور چونکہ وہی علت و فلسفہ یہاں بھی موجود ہے۔ لہٰذا یہاں بھی یہی حکم ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ احکام دین کی بنیاد "شاید" پر کھڑی کی گئی۔ ایسے مقامات ایک دو نہیں تھے جہاں حدیث ناکافی ثابت ہوئی۔ دنیائے اسلام میں خاص طور سے عباسیوں کے زمانہ میں زیادہ وسعت پیدا ہوئی مختلف ممالک فتح ہوئے اور ضرورتیں نت نئے مسائل کی شکل میں سر اٹھانے لگیں اور جب لوگ قرآن و احادیث میں ان کا حل نہیں پاتے تو دھڑادھڑ قیاس آرائیوں سے کام لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو گروہ بن گئے ایک فرقہ قیاس کا منکر ہوگیا جس میں احمد بن حنبل اور مالک بن انس شامل تھے (مالک بن انس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی میں صرف دو مسئلہ میں قیاس کیا) دوسرا گروہ تھا جس نے قیاس کے رہوار کو بے لگام چھوڑ دیا اور وہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ اس کے علم بردار ابوحنیفہ تھے۔ ابوحنیفہ کہتے تھے کہ یہ تمام حدیثیں جو پیغمبرؐ سے ہم تک پہنچی ہیں بالکل قابل اعتماد نہیں ہیں کیونکہ نہیں معلوم کہ واقعی پیغمبرؐ نے یہ باتیں ارشاد فرمائی ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے: میرے نزدیک تو آنحضرتؐ کی صرف پندرہ حدیثیں ثابت ہیں جن کے بارے میں ہی کہہ سکتا ہوں کہ انہیں پیغمبرؐ نے فرمایا ہے اور بس۔ بقیہ مسائل میں ابوحنیفہ قیاس کرتے تھے۔ شافعی نے میانہ روی اختیار کر رکھی تھی یعنی بعض مسائل میں احادیث پر اعتماد کرتے تھے اور بعض مواقع پر قیاس سے کام لیتے تھے۔ نتیجۃً فقہ ایک عجیب و غریب کھچڑی کی شکل اختیار کر گئی۔

کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ چونکہ نسلی طور پر ایرانی تھے اور ایرانیوں کی توجہ عقلی مسائل کی طرف زیادہ ہوا کرتی ہے مزید یہ کہ مرکز حدیث اور اہل حدیث یعنی مدینہ سے دور عراق میں زندگی بسر کرتے تھے لہٰذا بہت زیادہ قیاس واقع ہوئے تھے۔ بیٹھے بیٹھے قیاس کے تانے بانے بنا کرتے تھے۔ خود اہل سنت نے لکھا ہے کہ ایک روز آپ حجام کے یہاں گئے، آپ کی داڑھی کے بال کھچڑی تھے، ابھی سفید بال زیادہ نہیں تھے، حجام سے کہا، سارے سفید بال اکھاڑ دو۔ خیال یہ تھا کہ اگر تمام سفید بال جڑ سے اکھڑ جائیں گے تو انکا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ حجام نے کہا، اتفاق سے سفید بالوں کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اکھاڑ دئے گئے تو اور زیادہ نکل آئیں گے۔ آپ نے فوراً قیاس کر کے فرمایا، تو سیاہ بالوں کو اکھاڑ ڈالو، یہ قیاس ہے۔ آپ نے قیاس یہ کیا کہ اگر سفید بال اکھاڑنے سے زیادہ لگتے ہیں تو جب سیاہ بال اکھاڑے جائیں گے وہ بھی زیادہ اگیں گے۔ جبکہ اگر یہ قاعدہ ہو بھی تو صرف سفید بالوں کے لئے جاری کیا جائے گا، کالے بالوں کے لئے نہیں۔ چنانچہ آپ فقہ میں بھی یہی طریقہ عمل میں لاتے تھے۔

قیاس اور شیعوں کا نظریہ

جب ہم شیعوں کی روایات کو دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ وہ قیاس کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے بلکہ بنیادی طور سے اس فکر ہی کو غلط اور اشتباہ سمجھتے ہیں کہ کتاب خدا اور احادیث پیغمبرؐ کافی و وافی نہیں ہیں۔ قیاس کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جب یہ کہا جائے کہ کتاب و سنت تمام احکام دین بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور چونکہ وہ ناکافی ہیں اس لئے قیاس سے کام لیا جائے۔ جبکہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ خود پیغمبر اسلام سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کے اوصیاء کرام کے ذریعہ احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے کہ ان حدیثوں کے کلیات کی طرف رجوع کرنے کے بعد قیاس کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ دینی نقطہ نظر سے امامت کی روح یہی ہے کہ اس کے ذریعہ احادیث کا یہ ذخیرہ ہم تک پہنچا۔ اسلام صرف ایک مسلک نہیں ہے، جس کا بانی اپنے افکار و نظریات کا اجراء کرنے کے لئے حکومت کا محتاج ہوتا ہے۔ حکومت کا اس میں کیا دخل اسلام ایک دین ہے ——— ایک دین کی وضع اور وہ بھی اسلام جیسے دین کی اہمیت و ہمہ گیری کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

معصوم کی موجودگی میں انتخاب کی گنجائش ہی نہیں

امت کی قیادت رہبری کی رو سے امامت کا مسئلہ یہ ہے کہ اب جبکہ پیغمبرؐ کے بعد ان ہی کے زمانہ کی طرح ایک معصوم موجود ہے اور پیغمبر نے خود ایسے شخص کو اپنا نائب و وصی معین فرمادیا ہے جو عام افراد کی سطح کا نہیں ہے بلکہ اس میں پیغمبرؐ جیسی ہی استثنائی صلاحیتیں موجود ہیں۔ چنانچہ ایسے شخص کی موجودگی میں کسی بھی انتخاب یا شوریٰ وغیرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی، جس طرح پیغمبرؐ کے زمانہ میں یہ سوال نہیں اٹھتا تھا کہ پیغمبرؐ تو صرف پیغام لانے والے ہیں اور ان پر وحی نازل ہوتی ہے اب حکومت کا مسئلہ طے کرنا شوریٰ یا عوام کی ذمہ داری ہے، عوام آئیں اور رائے دیں کہ خود پیغمبرؐ کو حاکم قرار دیا جائے یا کسی دوسرے کو حاکم بنایا جائے بلکہ سب کا یہی خیال تھا کہ پیغمبرؐ جیسے مافوق بشر انسان کامل کے ہوتے ہوئے جو عالم وحی سے بھی رابطہ رکھتا ہے اس طرح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے بعد بھی اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کے ایسے بارہؑ جانشین موجود ہیں، جو دو تین صدیوں کے عرصہ میں اسلام کی بنیادوں کو پورے طور سے مستحکم کردیں اور اسلام صاف وشفاف سرچشمہ اور معصوم زبانوں سے بیان کیا جارہا ہے۔ اسلامی احکام بیان کرنے والے ایسے معصوم افراد کے ہوتے ہوئے کسی انتخاب یا شوریٰ کی گنجائش بہرحال نہیں رہ جاتی۔ کیا یہ بات عقل میں آنے والی ہے کہ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہو جو معصوم ہونے کے ساتھ ایسا عالم بھی ہو جس سے کسی خطا یا اشتباہ کا امکان بھی نہ پایا جاتا ہو اس کے باوجود اس کی جگہ پر ہم کسی دوسرے کا انتخاب کریں؟!

اس کے علاوہ جب علیؑ پیغمبرؐ کی جانب سے ایک ایسی امامت وجانشینی پر فائز ہوئے تو قہری طور پر دنیاوی حاکمیت و رہبری بھی ان ہی کے شایان شان ہوگی۔ پیغمبرؐ نے بھی علیؑ کے لئے اس منصب کی صراحت کردی ہے۔ لیکن آنحضرتؐ نے منصب امامت کی صراحت و وضاحت اس لئے فرمائی ہے کہ وہ اس دوسرے منصب کے حقدار بھی ہیں۔ بنابرایں غیبت امام زمانہؑ کے دوران جبکہ ویسے ہی وسیع اختیار کا حامل کوئی معصوم امام موجود نہیں ہے یا اگر فرض کرلیں کہ اگر صدر اسلام میں وہ حالات پیش نہ آتے اور حضرت علیؑ ہی خلیفہ وجانشین ہوتے، ان کے بعد امام حسنؑ، پھر

امام حسینؑ اور یہ سلسلہ حضرت ولی عصرؑ تک قائم رہتا اور وہ صورت رونما ہوتی جو امام کی غیبت کا سبب بنی اور ان کے بعد جب کوئی امام معصوم ہمارے درمیان موجود نہ ہوتا تب حکومت کا مسئلہ دوسرا ہو جاتا۔ اور اس وقت یہ سوال اٹھتے کہ یہ حکومت کس کا حق ہے؟ کیا حاکم، فقیہ جامع الشرائط ہی ہو سکتا ہے؟ یا یہ چیز حکومت کے لئے لازم نہیں ہے۔ کیا عوام کو حاکم کے انتخاب کا حق ہے؟ یا ....؟!

بنابرایں ہمیں مسئلہ امامت کو ابتداء سے ہی حکومت جیسا سادہ اور دنیاوی مسئلہ نہیں بنا دینا چاہیئے، تاکہ پھر اسکی روشنی میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ اسلام کی نظر میں حکومت زبردستی کی تنصیص و تعیینی ہے یا انتخابی؟ اور پھر یہ سوال پیدا ہو کہ آخر شیعہ اس طرح کی حکومت پر کیوں اصرار کرتے ہیں؟ اصل میں مسئلہ یوں نہیں ہے بلکہ شیعوں کے یہاں تو امامت کا مسئلہ ہے اور امام کی ایک شان حکومت بھی ہے۔ اور یہ طے ہے کہ امام معصوم کے ہوتے ہوئے کسی اور کو حکومت کا حق نہیں ہے۔ اور پیغمبر اکرمؐ نے علیؑ کو منصب امامت پر معین فرمایا ہے، جس کا لازمہ حکومت بھی ہے اس کے علاوہ بعض مواقع پر لفظ حکومت سے بھی علیؑ کی حاکمیت کی صراحت فرمائی ہے لیکن اس کی بنیاد بھی امامت ہی کو قرار دیا ہے۔

روحانی و معنوی ولایت

میں اس موضوع پر گزشتہ بحث کے دوران ایک بات عرض کر چکا ہوں۔ البتہ میں خود ذاتی طور پر اس کا اعتقاد رکھتا ہوں اور اس کو ایک بنیادی مسئلہ سمجھتا ہوں لیکن وہ بات شاید شیعیت کے ارکان میں شمار نہیں ہوتی۔ اور وہ یہ کہ کیا پیغمبر اکرمؐ کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ آپ پر خدا کی طرف سے الہی احکام اور اسلام کے اصول و فروع وحی ہوتے تھے۔ اور وہ صرف اسلام ظاہری و واقعی سے ہی متعلق معلومات رکھتے تھے، کیا آپ کی شان یہ نہیں تھی کہ خدا کی جانب سے اس کے علاوہ اور بھی کچھ جانتے اور کیا منزل عمل و تقوائے پروردگار میں بھی وہ (صرف) خطاؤں سے محفوظ و معصوم تھے اور بس؟ یوں ہی کیا ائمہ معصومین علیہم السلام کا مرتبہ بھی فقط اتنا ہی ہے کہ اگرچہ ان پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے اسلام کے اصول و فروع اور کلیات و جزئیات، پیغمبرؐ سے حاصل کئے ہیں اور جس طرح پیغمبرؐ سے علم و عمل میں کوئی غلطی یا اشتباہ نہیں ہوتا یوں ہی وہ بھی خطاؤں

سے محفوظ و معصوم ہیں اور بس ؟ یا پیغمبر اسلام اور ائمہ علیہم السلام کے مراتب اس سے بڑھ کر بھی کچھ اور ہیں؟ یہ حضرات دین و معارف سے ... بطہ اسلامی مسائل کے علاوہ اور کن علوم سے آگاہ تھے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ انسانوں کے اعمال پیغمبر کی ... ست میں پیش کئے جاتے ہیں؟ حتی ہر امامؑ کے زمانہ میں اس عہد کے لوگوں کے اعمال امامؑ کی خدمت میں بھی پیش ہوتے ہیں؟ مثال کے طور پر آج امام زمانہؑ نہ صرف شیعوں بلکہ تمام انسانوں پر حاضر و ناظر ہیں ان کے اعمال سے واقف ہیں اور کسی سے بھی غافل نہیں ہیں؟ حد یہ ہے کہ امام کے لئے حیات اور موت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، جب آپ امام رضاؑ کی زیارت کو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "السلام علیک" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس دنیا میں ایک زندہ انسان کے روبرو کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: "السلام علیک" اور وہ بھی یوں ہی آپ کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ یہی ولایت معنوی ہے۔

یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس نقطہ پر عرفان اور تشیع میں مشابہت اور یک رنگی پائی جاتی ہے، یعنی دونوں کے افکار ایک دوسرے سے کافی نزدیک ہیں۔ اہل عرفان کا اعتقاد ہے کہ ہر دور میں ایک نہ ایک قطب اور انسان کامل ضرور ہونا چاہیئے۔ اور شیعہ کہتے ہیں کہ ہر دور میں روئے زمین پر ایک امام و حجت ضرور رہتا ہے اور وہی انسان کامل ہے اور ... ہم فی الحال اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کیونکہ اس مسئلہ میں ہم میں اور اہل سنت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شیعہ اور اہل سنت میں اختلاف ان دو مسئلوں میں ہے جن کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔ ایک یہ کہ امامت، احکام دین بیان کرنے کی ذمہ دار ہے اور دوسرے امامت یعنی مسلمانوں کی قیادت و رہبری۔

حدیث ثقلین کی اہمیت

امامت کے مسئلہ میں "حدیث ثقلین" کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر آپ کسی عالم اہل سنت یا ایک عام سنی سے ہی ملاقات کریں تو اس سے پوچھیں کہ آیا کوئی جملہ پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ نہیں؟ اگر وہ انکار کرے تو اس کے جواب میں ان ہی کی متعدد کتابیں ان کے سامنے پیش کی جا سکتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ علماء اہل سنت کسی طرح بھی اس حدیث کے وجود

یا اس کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے اور حقیقتاً انکار کرتے بھی نہیں ہیں۔[1]

اس کے بعد آپ ان سے پوچھیں کہ یہ جو پیغمبرؐ نے قرآن اور عترت واہل بیت کو دین کے حصول کے لئے الگ الگ مرجع قرار دیا ہے، آخر یہ اہل بیتؑ کون سے افراد ہیں؟ اصل میں یہ حضرات پیغمبر کی عترت اور غیر عترت میں کسی فرق و امتیاز کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ وہ صحابہ اور غیر صحابہ سے روایتیں بھی نقل کرتے ہیں تو علیؑ سے کہیں زیادہ دوسروں سے نقل کرتے ہیں اور علیؑ سے اگر کبھی کوئی روایت نقل کی بھی ہے تو صرف ایک راوی کے عنوان سے، نہ کہ ایک مرجع و مصدر کی حیثیت سے۔

حدیث غدیر

ہم عرض کر چکے ہیں کہ جو دین کے منبع و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے، وہی دین کا رہبر بھی ہوگا۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کی رہبری کے سلسلہ میں بھی صراحت سے ذکر کیا ہے۔ اس کا ایک نمونہ حدیث غدیر ہے، جسے پیغمبر اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے دوران غدیر خم کے مقام پر ارشاد فرمایا تھا۔ حجۃ الوداع پیغمبرؐ اسلام کا آخری حج ہے۔ شاید آپؐ نے فتح مکہ کے بعد ایک سے زیادہ حج نہیں فرمایا۔ البتہ حجۃ الوداع سے پہلے حج عمرہ ادا کیا تھا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے عام اعلان فرمایا اور لوگوں کو خصوصیت

---

[1] بعض اہل منبر اور مجلس پڑھنے والے افراد نے اس حدیث کی عظمت و اہمیت کو کم کر ڈالا ہے، اور اسے یوں پیش کرنے لگے ہیں کہ مفہوم حدیث بدل کر رہ گیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ اکثر و بیشتر اس حدیث کو مصائب بیان کرنے کے لئے گریز کے طور پر پڑھنے لگے لہٰذا انسان یہ سوچنے لگا کہ اس حدیث سے پیغمبرؐ کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں یعنی قرآن و عترت۔ ان دونوں کا احترام تم پر لازم و واجب ہے۔ دیکھو ان کی توہین و اہانت نہ کرنا۔ جبکہ حدیث کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایک قرآن ہے جس سے تمسک اختیار کرو اور اس کے احکام پر عمل کرو اور دوسرے اہل بیت ہیں جن کی طرف رجوع کرو اور ان کی تعلیمات و ہدایات پر عمل کرو۔ کیونکہ آنحضرتؐ اسی حدیث میں آگے فرماتے ہیں: "لن تضلوا ما ان تمسکتم بھما ابدا" جب تک ان دونوں سے متمسک رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔ معلوم ہوا یہاں دونوں کی طرف رجوع کرنے اور تمسک اختیار کرنے کی بات کہی جا رہی ہے۔ پیغمبرؐ نے تمسک و رجوع کی منزل میں عترت کو قرآن کا ہم پلہ قرار دیا ہے کہ ان سے قرآن ہی کے مانند تمسک اختیار کیا جائے۔ خود پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ قرآن "ثقل اکبر" ہے اور عترت "ثقل اصغر" ہے۔

سے اس حج میں شرکت کی دعوت دی۔ گویا مسلمانوں کے کثیر مجمع کو اپنے ہمراہ لیا اور مختلف مقامات یعنی مسجد الحرام میں، عرفات میں، منیٰ میں اور منیٰ سے باہر نیز غدیر خم وغیرہ میں تمام مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے متعدد خطبے ارشاد فرمائے۔ منجملہ غدیر خم میں جبکہ آپ جگہ جگہ پر مغز مطالب بیان فرما چکے تھے، ایک مسئلہ کو آخری مطلب کے طور پر بڑے شد ومد کے ساتھ بیان فرمایا: "یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ"[1] (اے رسول! آپ وہ امر لوگوں تک پہنچا دیجئے جو آپ کے پروردگار کی جانب سے آپ پر نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا رسالت ہی انجام نہ دی۔) اگر پیغمبر اکرم نے اس سے قبل عرفات، منیٰ اور مسجد الحرام میں اپنے خطبوں کے درمیان اصول و فروع کے تمام اسلامی کلیات بیان کر دیئے تھے۔ اور وہ بیانات آپ کے اہم ترین خطبات میں ہیں۔ پھر اچانک غدیر خم میں فرماتے ہیں کہ اب میں وہ بات بیان کر رہا ہوں کہ اگر اسے ذکر نہ کیا تو گویا رسالت ہی انجام نہ دی "فما بلغت رسالتہ" یعنی مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ اگر اسے نہ بیان کیا تو کچھ بھی بیان نہ کیا یعنی پوری رسالت کی محنت بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں: الست اولیٰ بکم من انفسکم؟ (کیا میں تمہارے نفسوں (یا تم) پر تم سے زیادہ حاکم نہیں ہوں)۔ یہ قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: "النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم"[2] (نبی مومنین کے نفسوں پر ان سے زیادہ حاکم و ولی ہے) چنانچہ جب آپ نے فرمایا: کیا تم پر میرا حق تسلط اور ولایت خود تم سے زیادہ نہیں ہے؟ سب نے ایک ساتھ کہا: بلیٰ (ہاں) یا رسول اللہ تو حضرت نے فرمایا: "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ" یہ حدیث بھی حدیث ثقلین کی طرح بہت سے اسناد رکھتی ہے

حدیث غدیر جو متواتر ہے اگر ہم اس کے مدارک و اسناد کی تحقیق کے میدان میں قدم رکھیں یا یوں ہی حدیث ثقلین جس کے اسناد و مدارک میر حامد حسین طاب ثراہ نے "عبقات الانوار" میں جمع کئے ہیں جو بڑی سائز کے چار سو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ان حدیثوں کی تحقیق کی جائے تو بحث بہت طویل ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں مزید تحقیق کی ضرورت ہو پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ مسئلہ امامت کے تحت بحث کا ایک خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ ساتھ ہی ان ثبوت و مدارک کا بھی ایک اجمالی جائزہ پیش کر دوں جنھیں شیعہ امامت کے سلسلہ میں سند کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

---

1. مائدہ/۶۷

2. سورہ احزاب/۶

شرح تجرید

امامت کی بحث میں علمائے شیعہ کی منطق کیا ہے اور اگر دوسرے اس بارے میں کچھ کہتے ہیں تو کیا کہتے ہیں اسے پورے طور سے روشن و واضح کرنے کے لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس سلسلہ میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی تحریر کردہ اصل عبارت، ضروری وضاحت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ یہ متن عبارت بہت ہی مختصر اور خلاصہ ہے اور ان کے عہد کے بعد سے شیعہ اور اہل سنت دونوں فرقوں کے علماء کے درمیان مورد ذکر رہی ہے۔

آپ نے اس کتاب کا نام ضرور سنا ہوگا۔ خواجہ کی تصنیف کردہ یہ کتاب "تجرید" کے نام سے مشہور ہے، اس کا ایک حصہ علم منطق پر مبنی ہے جسے "منطق تجرید" کہتے ہیں اور دوسرا حصہ علم کلام میں ہے جس میں توحید، نبوت، امامت، معاد..... جیسے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ توحید کا باب زیادہ تر فلسفیانہ طرز کا ہے، اور اس باب میں خواجہ نے فلاسفہ کی روش پر بحث کی ہے۔ علامہ حلی نے اس کتاب کے دونوں حصوں کی شرح فرمائی ہے۔ علامہ حلی بھی، جن کے بارے میں آپ نے یقیناً بہت کچھ سنا ہوگا، عالم اسلام کے عظیم ترین فقہا میں شمار ہوتے ہیں۔ انھیں نہ صرف فقہائے شیعہ میں بلند مقام حاصل ہے بلکہ پورے عالم اسلام کے فقہا میں ایک عظیم درجہ پر فائز ہیں۔ وہ منطق، فلسفہ، کلام اور ریاضیات وغیرہ میں خواجہ نصیر الدین طوسی کے شاگرد تھے اور فقہ میں آپ کو محقق حلی صاحب کتاب "شرائع الاسلام" سے شرف تلمذ حاصل تھا جو خود بھی دنیائے شیعیت میں صف اول کے فقیہ تھے۔ علامہ اور خواجہ دنیائے علم میں نادر روزگار شمار

تیسری بحث

مسئلۂ امامت کی کلامی تحقیق

کئے گئے ہیں۔ خواجہ نصیر الدین طوسی دنیا کے صف اول کے ریاضی دانوں میں گنے جاتے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے اخباروں میں اعلان ہوا ہے کہ چاند کے کچھ حصوں کو چند ایرانی ریاضی دانوں کے نام دیئے گئے ہیں، مثلاً عمر خیام، ابن سینا، اور خواجہ نصیر الدین۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے کرۂ ماہ کے بارے میں بعض فرضیات قائم کئے تھے۔ علامہ بھی اپنے فن یعنی فقہ میں بلاشبہ نادر زمانہ ہیں۔ آپ نے بے شمار کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "تذکرۃ الفقہا" ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ حقیقت میں جب انسان اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو ان کے تبحر علمی پر دنگ رہ جاتا ہے۔

"تذکرۃ الفقہا" ایک فقہی کتاب ہے، لیکن اس میں صرف شیعہ فقہ ہی بیان نہیں ہوئی ہے بلکہ ہر مسئلہ میں تمام علماء اہل سنت کے فتوے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس میں نہ صرف اہل سنت کے چاروں امام، ابو حنیفہ، شافعی، مالک اور احمد حنبل کے فتوے موجود ہیں بلکہ مذاہب کے ان چار اماموں میں منحصر ہونے سے پہلے کے تمام بزرگ فقہا کے فتاوے بھی اس میں نقل کئے گئے ہیں۔ ہر مسئلہ کے تحت یہ صراحت موجود ہے کہ یہاں ابو حنیفہ نے یوں کہا ہے، شافعی یہ کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم امامیہ کا قول یہ ہے۔ اکثر کسی مسئلہ کی کاٹ یا نکتہ چینی بھی کرتے نظر آتے ہیں مثال کے طور پر شافعی نے ایک جگہ یہ کہا ہے، دوسری جگہ اس کے مخالف مطلب بیان کیا ہے یہ پہلے یہ کہا اور بعد میں اپنے قول سے عدول کر کے دوسری بات کہی ہے۔ آقائے شیخ محمد تقی فرماتے ہیں کہ جب تذکرہ جیسی کتاب چھاپی ہوئی تو تمام مذاہب اہل سنت کے قابل و ماہر علماء کو بلایا گیا۔ انھیں یہ کتاب دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ کیسا شخص ہے، جو ہمارے اقوال و مسائل پر ہم سے بھی زیادہ حاوی ہے۔ آپ ایسی ہی غیر معمولی استعداد کے حامل تھے۔

ان ہی علامہ نے کتاب تجرید کی شرح لکھی ہے۔ منطق کا حصہ "الجوہر النضید" کے نام سے مشہور ہے جو منطق کی ایک بہترین کتاب ہے، اور علم کلام کے حصہ کی شرح کا نام "کشف المراد" ہے جسے آج کل شرح تجرید کہتے ہیں۔ منطق اور کلام دونوں میں علامہ کی شرح بہت مختصر ہے۔ ان کے بعد بھی اس کتاب پر برابر شرحیں اور حاشیے لکھے جاتے رہے کسی نے اس کی رد کی تو کسی نے تائید، اور شاید دنیائے اسلام میں کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی جو "تجرید" کے برابر بحث کا موضوع بنی ہو۔ یعنی اس کتاب کے متن پر جتنی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے کسی اور کتاب پر نہیں لکھے گئے۔ ہر زمانہ میں یا اس کی رد میں شرحیں لکھی جاتی رہیں یا تائید میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خواجہ نے شیعی مذاق کے مطابق مسائل و مطالب بیان

کرنا چاہا ہے تو بڑے ہی مختصر اور جامع انداز میں اجمالی طور پر اشاروں میں بات کہتے ہوئے سرسری طور پر گزر گئے ہیں۔ آپ نے کتاب تجرید کے آخری ابواب میں امامت کے موضوع پر بحث فرمائی ہے۔ یہ بحث چونکہ تمام علماء شیعہ کی نگاہ میں مورد قبول واقع ہوئی ہے لہٰذا اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ امامت کے سلسلہ میں علماء شیعہ کی منطق کیا ہے۔

اس وقت جو کتاب میرے پیش نظر ہے۔ کتاب تجرید پر ملا علی قوشجی کی شرح ہے۔ ملا علی قوشجی اہل سنت کے بزرگ علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ فطری بات ہے کہ چونکہ وہ مخالف نظریہ رکھتے ہیں لہٰذا اس میں اہل سنت کے نظریات کو منعکس کرتے ہیں اور زیادہ تر خواجہ نصیر الدین کی رد کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں خواجہ کے شیعی نظریات کے ساتھ اہل سنت کے نظریات بھی بیان ہوئے ہیں۔

امامت کی تعریف

اس میں سب سے پہلی بات جو امامت کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہے، وہ امامت کی تعریف ہے۔ اس تعریف میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کہتے ہیں: (الامامۃ) ریاسۃ عامۃ فی امور الدین والدنیا" یعنی (امامت) دینی و دنیاوی دونوں امور میں ریاست و امارت عامہ کو کہتے ہیں۔ خواجہ نصیر الدین علم کلام کی تعبیر میں فرماتے ہیں: "الامام لطف" یعنی امام لطف پروردگار ہے۔ مقصد یہ ہے کہ امامت بھی نبوت کے مانند ان مسائل میں سے ہے جو بشری حدود و اختیارات سے بالاتر ہیں، یہی وجہ ہے کہ "امام کا انتخاب" بھی انسانی استطاعت اور قوت سے باہر کی چیز ہے۔ اسی لئے اس کا تعین خدا کی طرف سے ہے۔ امامت بھی نبوت کی طرح ہے جسے خدا کی جانب سے وحی کے ذریعہ معین و مقرر ہونا چاہیے۔ بس ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پیغمبر براہ راست خدا کی جانب سے معین ہوتا ہے اور اس کا تعلق بھی خدا سے براہ راست ہوتا ہے جبکہ امامت کی تعیین خدا کی طرف سے پیغمبر کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔

امامت کے بارے میں شیعہ عقلی دلیل

خواجہ نصیر الدین اس مقام پر اس ایک جملہ سے زیادہ کچھ بیان نہیں کرتے۔ لیکن علماء شیعہ اس سلسلہ

بی جو وضاحت فرماتے ہیں۔ اس کی بنیاد وہی ہے جسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ پہلے ایک تاریخی بحث
پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سردست بحث حضرت علیؑ کی امامت میں ہے، اگر یہ ثابت ہو گئی تو بقیہ ائمہ کی امامت
بھی پہلے امام کی نص سے تمسک کے ذریعہ بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو جائے گی۔ شیعہ علماء کہتے ہیں کہ یہ بات روشن و واضح
ہے کہ دین اسلام دین خاتم ہے اور یہ طے ہے کہ اس کے بعد اب کوئی دوسری شریعت آنے والی نہیں ہے۔
اور یہ ایسا کلی اور جامع دین ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ اس دین کی حقیقت بھی یہی ثابت کرتی
ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتا ہے اور تمام مسائل میں دخیل ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں، کیا
حیات پیغمبر اکرمؐ کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھیں ذاتی طور پر اس قدر فرصت ملی ہو اور مواقع فراہم ہوتے
ہوں کہ انہوں نے تمام اسلام لوگوں کو تعلیم فرما دیا ہو؟ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس
تیئس ۲۳ سالہ زندگی میں پیغمبرؐ کو اس قدر فرصت اور موقع حاصل نہ ہو سکا۔ یقیناً پیغمبر اسلامؐ نے خود کوئی بھی
موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور بہت سی باتیں تعلیم فرما دیں۔ لیکن پیغمبر اکرمؐ کی مکی و مدنی زندگی اور اس میں آپکی
مصروفیات، مشکلات اور دشواریوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات ماننی پڑے گی کہ بلاشبہ یہ مختصر سی مدت پورے
احکام اسلام کو کامل طور پر تمام لوگوں میں بیان کرنے کے لئے ناکافی تھی۔ ساتھ ہی اس کا بھی امکان نہیں ہے کہ
یہ دین جو خاتم ہے ناقص بیان کیا گیا ہو۔ چنانچہ ایسے کسی ایک یا چند افراد کا اصحاب پیغمبرؐ میں ہونا ضروری ہے،
جنھوں نے کامل و تمام اسلام پیغمبرؐ سے حاصل کر لیا ہو اور جو پیغمبر اسلام کے پورے آراستہ و پیراستہ شاگرد رہے
ہوں تاکہ آپکے رخصت ہونے کے بعد اسلام کے بیان اور اس کی وضاحت میں آپ ہی کے مثل و نظیر ہوں بس
فرق یہ ہو کہ پیغمبرؐ وحی کے ذریعہ دین بیان فرماتے تھے اور یہ افراد پیغمبرؐ سے علوم حاصل کر کے بیان کرنے والے
ہوں۔ اس کے بعد علماء فرماتے ہیں، چونکہ آپ (اہل سنت) نے پیغمبرؐ کے بعد کسی ایسے شخص کا سراغ حاصل
نہیں کیا اور اس کی طرف رجوع نہیں کیا۔ لہٰذا خواہ مخواہ ابتدا ہی سے آپنے دین اسلام کو ناقص تصور کر لیا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ آپ قیاس سے کام لینے لگے۔ اور درست بھی ہے، قیاس کا مسئلہ اہل سنت کے یہاں اس وقت
سے پیش آیا جب یہ سوال پیدا ہونے لگا کہ وہ مسائل جن کا حکم جاننا ضروری ہو لیکن اس سلسلہ میں کوئی
حدیث پیغمبرؐ سے ہم تک نہ پہنچی ہو تو کیا کریں؟ کہنے لگے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک موضوع
کا دوسرے موضوع سے مقائسہ کر کے ظنی اور گمانی مشابہت کی بنیاد پر ایسے مسائل کا حکم استنباط کیا جائے
یہ بات علماء شیعہ کی کہی ہوئی نہیں ہے بلکہ حضرت علیؑ کے عہد سے ہی یہ صورت شروع ہو چکی تھی نہج البلاغہ

اور دیگر ائمہ کرام کے اقوال میں بھی اس روش پر صاف اعتراضات موجود ہیں کہ یہ کیا باطل خیال ہے؟ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "ام انزل اللہ دینا ناقصا" ؟ کیا خداوند عالم نے ناقص دین نازل فرمایا ہے جس میں انسان کو اپنی ناقص رائے کی بھی ضرورت ہے؟ دیگر تمام ائمہ علیہم السلام نے بھی اس مسئلہ پر بڑا زور صرف کیا ہے کہ دین میں کسی طرح کا نقص ہے ہی نہیں کہ ہم سوچیں کہ بعض مسائل میں نقص پایا جاتا ہے، اور چونکہ بعض دینی مسائل میں نقص پایا جاتا ہے لہٰذا ہم اپنی رائے اور گمان کے ذریعہ ان کا حکم معلوم کریں۔ اصول کافی میں [باب الرد الی الکتاب والسنۃ وانہ لیس شئ من الحلال والحرام الا وقد جاء فیہ کتاب اوسنۃ] کے نام سے مستقل ایک باب موجود ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ کتاب وسنت میں کم از کم اس کی صورت موجود نہ ہو۔ تمام کلی مسائل ذکر ہو چکے ہیں صرف ان کا مصداق تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ شیعی نقطۂ نظر سے اجتہاد اسی کو کہتے ہیں۔ یعنی اسلام کے تمام کلی احکام موجود ہیں۔ مجتہد کا کام یہ ہے کہ ان کلیات کو جزئیات پر منطبق کرتا چلا جائے۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کلیات بھی کافی نہیں ہیں، مسائل سے مشابہت رکھنے والے احکام کو دیکھ کر گمان اور قیاس کے ذریعہ فقط اندازہ کی بنیاد پر مسئلہ کا حکم حاصل کیا جائے۔

چنانچہ (علماء شیعہ) کہتے ہیں کہ ہم دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ پیغمبر اکرم اپنی تیئیس سالہ زندگی میں اسلام کے تمام احکام کلی طور پر سبھی لوگوں سے بیان نہیں کر سکے۔ البتہ آپ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ یونہی سب کچھ ادھورا چھوڑ کر چلے گئے اور ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ جس دلیل کے تحت پیغمبرؐ لوگوں پر مبعوث ہوئے تھے اسی دلیل سے پیغمبرؐ کی جانب سے بھی کچھ افراد معین ہوئے جو قدسی صفات کے حامل تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے اسلام کے تمام حقائق ان میں کی پہلی فرد یعنی حضرت علیؑ کو تعلیم کر دیئے اور یہ افراد بھی ہر سوال کا جواب دینے کی پورے طور سے صلاحیت و آمادگی رکھتے تھے۔ حضرت علیؑ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے، مجھ سے اسلام کے بارے میں جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لو تاکہ میں اسے بیان کر دوں۔

امام یعنی احکام دین کا ماہر

اب ہم اس مفہوم کو آج کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ (علماء شیعہ) کہتے ہیں کہ یہ جو آپ ان خصوصیات کے حامل امام کے وجود کے منکر ہیں تو درحقیقت آپ اسلام کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں۔

ایک معمولی مشین بھی جب کہیں بھیجی جاتی ہے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا ماہر بھی اس کے ہمراہ بھیجا جائے مثال کے طور پر اگر امریکہ یا روس اپنے فینٹم یا مگ جیسے جنگی جہاز کسی ایسے ملک کو دیتے ہیں جہاں کے لوگ اس کی مشینری سے واقف نہیں ہوتے تو لوگوں کو اس کی باریکیوں سے آگاہ کرنے کے لئے ماہرین بھی ان کے ہمراہ روانہ کرتے ہیں۔ ہاں کوئی عام اور سادہ سی چیز ہو تو اس کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً اگر کوئی ملک کسی ملک کو کپڑا فروخت کرے تو اس کے لئے ماہرین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کی نظر میں یہ اسلام جو خداوند عالم کی طرف سے بنی نوع انسان کے پاس بھیجا گیا ہے، اسے آپ کیا خیال کرتے ہیں؟ کیا وہ ایک کپڑے کی مانند سادہ اور معمولی ہے کہ جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے تو اس کے ہمراہ کسی ماہر شخص کی ضرورت نہیں پڑتی؟ یا اسے ایک پیچیدہ مشین کی طرح سمجھتے ہیں کہ جب وہ کسی دوسرے ملک میں برآمد ہوتی ہے، اس کے ہمراہ اس کے ماہرین کا بھیجا جانا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ ایک مدت تک وہاں کے لوگوں کو اس کی باریکیوں سے آگاہ کر سکیں؟

امام یعنی امر دین کا ماہر جان کار، ایسا حقیقی ماہر جو کسی گمان یا شبہ میں نہ پڑتا ہو اور نہ اس سے کسی خطا کا امکان ہو۔ پیغمبر اسلام انسانوں کے لئے اسلام لے کر آئے ہیں۔ اب ضروری یہ ہے کہ کم از کم ایک مدت تک خداوند عالم کی طرف سے دین کے ماہر افراد لوگوں کے درمیان موجود رہیں تاکہ لوگوں کو اچھی طرح سے اسلام بتا اور سمجھا سکیں۔ ایسے ہی شخص کو پیغمبر اکرم نے لوگوں کے لئے معین فرمایا ہے۔ علماء شیعہ نے اس مطلب کو "لطف" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ تعین، لطف پروردگار ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ یہ اقدام انسان کی ہدایت کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ پیغمبر کے بعد خدا کی جانب انسان کی راہ بند ہے۔ اب لطف الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی جانب سے عنایت انسان کے شامل حال ہو، ویسے ہی جس طرح نبوت کے سلسلہ میں اس کی عنایت کو لطف کہتے ہیں، یہ بات اصول شیعہ میں سے ایک اصل کی حیثیت رکھتی ہے جسے دوسرے الفاظ میں امامت کے موضوع پر شیعوں کی عقلی دلیل بھی کہا جا سکتا ہے۔

عصمت کا مسئلہ

یہاں عصمت کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ جب شیعہ امام[۱] کو شریعت کے محافظ و نگہبان اور

---

[۱] شیعہ زیادہ تر امامت کے دینی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آجکل جہاں امامت کا مسئلہ سامنے آتا ہے ←

لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے سلسلہ میں ایک مرجع و منبع تسلیم کرتے ہیں، تو جس طرح وہ پیغمبر کے لئے عصمت کے قائل ہیں یوں ہی امام کو بھی معصوم جانتے ہیں۔ پیغمبرؐ کی عصمت کے سلسلہ میں کوئی شخص شک و شبہ نہیں کرتا اور یہ ایک واضح سی بات ہے۔ اگر ہمارے لئے یہ بات یقینی ہو جائے کہ یہ پیغمبرؐ کا قول ہے تو ہم اس کی صحت میں شک نہیں کرتے، اور صاف کہدیتے ہیں کہ یہ ارشاد پیغمبرؐ ہے تو درست اور حق ہے۔ ہم کبھی یہ نہیں کہتے کہ یہاں پیغمبرؐ نے اشتباہ یا غلطی کی ہے۔ جس شخص کو خداوند عالم نے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہو جبکہ لوگ الٰہی ہدایت کے محتاج ہوں، وہ شخص ہرگز ایسا انسان نہیں ہو سکتا جو خود خطاکار یا گناہ گار ہو۔ خطا دو طرح کی ہوتی ہے: ایک یہ کہ عمداً اور جان بوجھ کر خطا کی جائے۔ مثال کے طور پر خداوند عالم پیغمبرؐ کو حکم دے کہ فلاں پیغام پہنچا دو اور پیغمبر یہ دیکھے کہ اس کی اپنی مصلحت یا منفعت کا تقاضا کچھ اور ہے۔ اور اس بات کو دوسرے انداز سے لوگوں سے بیان کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نبوت کے سراسر خلاف ہے۔ اگر ہم امامت کی تعریف یوں کریں کہ امامت دین کے بیان کرنے میں نبوت کی متمم ہے، یعنی اس دلیل سے اس کا وجود لازم ہے کہ احکام دین کے بیان کرنے کے سلسلہ میں پیغمبرؐ کے فریضہ کو ادا کرے، تو جس دلیل سے پیغمبر اکرمؐ کا معصوم اور گناہوں سے بری ہونا ضروری ہے اسی دلیل سے امام کو بھی معصوم ہونا چاہئے۔ اگر کوئی کہے امام کا معصوم ہونا لازم نہیں ہے، اگر وہ

← بعض افراد مسئلہ حکومت کے مساوی قرار دے دیتے ہیں جس میں مسئلہ کا دنیاوی پہلو نمایاں ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ مسئلہ امامت کا بڑا حصہ دینی پہلو کا حامل ہے۔ اصل میں امامت اور حکومت میں نوعی اعتبار سے عموم و خصوص من وجہ جیسا ارتباط پایا جاتا ہے۔ امامت بذات خود ایک مستقل مسئلہ ہے اور حکومت جو امامت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے، ایک دوسرا مسئلہ ہے غیبت امام کے زمانہ میں حکومت کے سلسلہ میں تو گفتگو کی جاتی ہے لیکن امامت کی بات سامنے نہیں آتی۔ امامت کو حکومت کے مساوی قرار نہیں دینا چاہئے۔ علماء کی تعبیر میں امامت سے مراد دین و دنیا دونوں کی رہبری ہے۔ اور چونکہ امام دین کا رہبر ہوتا ہے لہٰذا قہری طور پر دنیا کا بھی حاکم ہے۔ مثلاً خود پیغمبرؐ جو دین کے رہبر تھے ہی، ساتھ ہی تبعی طور پر دنیا کے حاکم بھی تھے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ کسی زمانہ میں امام موجود نہ ہو یا پردۂ غیب میں ہو اور اس عنوان سے دین کی رہبری کا مسئلہ در پیش نہ ہو۔ اس وقت دنیاوی حاکمیت کا مسئلہ سامنے آئے گا کہ اس پر کسے حاکم ہونا چاہئے۔ امام کی موجودگی میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کوئی غلطی یا اشتباہ کرے گا تو کوئی دوسرا اسے آگاہ کر دے گا۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ پھر ہم اسی دوسرے شخص کی طرف رجوع کریں گے۔ اور اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو آخر کار کوئی نہ کوئی شخص تو ایسا ہوگا ہی جو (معصوم ہونے کے اعتبار سے) شریعت کا حقیقی محافظ ہوگا۔ اس کے علاوہ (بقول شیخ) اگر امام خطاکار و گنہگار ہو تو دوسروں کا فریضہ ہے کہ اسے راہ راست پر لائیں۔ جبکہ دوسروں کا فریضہ یہ ہے کہ امام کے مطیع و فرمانبردار رہیں۔ یہ دونوں باتیں آپس میں میل نہیں کھاتیں۔

تنصیص و تعیین کا مسئلہ

(علماء شیعہ) مسئلہ عصمت کے ذریعہ تنصیص و تعیین کے مسئلہ کو ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قضیہ کی کلامی صورت یہ ہے کہ اس سلسلہ کو خدا سے شروع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امامت خدا کی جانب سے بندوں پر لطف ہے۔ اور چونکہ لطف ہے لہذا اس کا وجود بھی لازمی و ضروری ہے۔ اور یہ لطف چونکہ بغیر عصمت کے ممکن نہیں ہے لہٰذا امام کو معصوم ہونا چاہئے اور اسی دلیل کے تحت منصوص بھی ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ امر (عصمت) ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے عام انسان تشخیص دے سکیں۔ بالکل یوں ہی جیسے پیغمبر کی تشخیص عوام یا بندے نہیں کر سکتے بلکہ یہ خدا کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کس کو پیغمبری کے لئے معین کرتا ہے اور اسے دلائل و آثار اور معجزات کے ذریعہ پہچنواتا ہے۔ امام کی تعیین بھی انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، وہ بھی خدا کی جانب سے معین ہونا چاہئے۔ بس دونوں میں فرق یہ ہے کہ پیغمبر کے تعارف کی منزل میں کوئی دوسرا شخص دخیل نہیں، لہذا معجزات کے ذریعہ اس کا تعارف کرایا جانا چاہئے۔ لیکن امام، پیغمبر کے ذریعہ پہچنوایا جاتا ہے۔ یہیں سے (علماء شیعہ) تنصیص کے مرحلہ میں قدم رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذکورہ معنی کے تحت امامت نص کے ذریعہ پیغمبرؐ کی جانب سے معین ہونی چاہئے نہ کہ عوام کی طرف سے منتخب۔ بنابرایں لطف کے مسئلہ سے مسئلہ عصمت تک اور مسئلہ عصمت سے تنصیص کے مسئلہ تک پہنچتے ہیں۔ یہاں تک پہنچتے ہیں تو اب چوتھا زینہ بھی طے کریں اور وہ یہ کہ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس کا علیؑ کی ذات سے کیا تعلق ہے؟ یہاں (خواجہ نصیر الدین طوسی) فرماتے ہیں:

ذھما مختصان بعلی" یعنی یہ دونوں باتیں (معصوم اور منصوص ہونا) علی علیہ السلام سے مخصوص ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی ایک شخص نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے کہ علیؑ کے علاوہ کوئی دوسرا منصوص نہیں ہے۔ یعنی بحث یہ نہیں ہے کہ دوسرے کہتے ہوں کہ پیغمبرؐ نے کسی اور کو معین فرمایا ہے اور ہم کہیں کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کو معین فرمایا ہے۔ بلکہ بحث یہ ہے کہ آیا پیغمبرؐ نے

کسی کو معین بھی فرمایا ہے یا نہیں ؟ اگر معین فرمایا ہے تو اس صورت میں علیؑ کے علاوہ کوئی اور شخص سامنے نہیں آتا۔ یا سرے سے کسی کو معین ہی نہیں فرمایا؟ اس صورت میں ہم یہی کہیں گے کہ نص وتنصیص لازم وواجب ہے اور پیغمبرؐ نے یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے ایک شخص کو لوگوں پر معین فرمایا ہے اور وہ شخص علیؑ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، کیونکہ دوسروں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ اس سے انکار ہی کرتے رہے ہیں۔ جتنی خلفاء بھی (اپنے سلسلہ میں) تنصیص وتعیین کا ادعا نہیں کرتے پھر دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ حد یہ ہے کہ خلفاء کے پیرو بھی ان کی تنصیص وتعیین کے مدعی نہیں ہیں۔ چنانچہ نص کے سلسلہ میں علیؑ کے علاوہ کسی اور کی بحث ہی نہیں ہے۔

عصمت کے سلسلہ میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ خلفاء اپنی عصمت کا نہ صرف ادعا نہیں کرتے تھے بلکہ صاف لفظوں میں اپنے اشتباہات اور غلطیوں کا اعتراف بھی کر لیتے تھے اور خود اہل سنت بھی ان کی عصمت کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم عرض کر چکے ہیں مسئلہ امامت ان کی نظر میں حکومت کا ہم معنی ہے۔ اور حکومت کے مسئلہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ حاکم اشتباہ یا گناہ نہ کرے۔ بلکہ ان ہی کے کہنے کے مطابق یہ افراد اشتباہ بھی بہت کرتے تھے اور گناہ کے مرتکب بھی ہوتے تھے لیکن ایک عادل انسان کی حد میں جو پیش نمازی کی لیاقت رکھتا ہے اہل سنت ان کے لئے اس سے زیادہ مرتبہ کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا اس جملہ کی عام طور سے اہل سنت نے روایت کی ہے اور "ملا قوشچی" بھی اسے قبول کرتے ہیں کہ ابوبکر کہا کرتے تھے: ان لی شیطانا یعترینی" ایک شیطان اکثر میرے اوپر مسلط ہو جاتا ہے اور مجھے بہکا دیتا ہے۔ لوگو! اگر مجھے غلط راہ پر چلتے ہوئے دیکھو تو مجھے راہ راست پر لا کر کھڑا کر دو۔ گویا آپ خود اپنے اشتباہ وگناہ کا اعتراف کیا کرتے تھے۔ عمر نے بہت سی جگہوں پر (اور بعض محققین کے مطابق ستر مقامات پر بہر حال شیعہ، سنی دونوں اس پر متفق ہیں کہ بہت سی جگہوں پر) فرمایا: "لولا علی لھلک عمر" اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ کوئی حکم دیتے تھے بعد میں حضرت علیؑ آ کر انھیں ان کی غلطی سے آگاہ کرتے تھے اور وہ اسے مان لیا کرتے تھے۔ چنانچہ نہ خود خلفاء اپنی عصمت کے دعویدار ہیں اور نہ دوسرے ان کی عصمت کے مدعی ہیں۔

اگر مسئلہ امامت کو اسی اعلیٰ سطح یعنی لطف، عصمت اور تنصیص کے معیار پر دیکھا جائے تو سوائے علیؑ کوئی اور اس کا دعویدار نظر ہی نہیں آتا۔ یہاں تک تو مسئلہ امامت کی کلامی بحث تھی یعنی جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں بات ادھر سے شروع ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جس دلیل سے نبوت لازم اور

لطف پروردگار ہے۔ یوں ہی امامت بھی لازم اور لطف خدا ہے تا آخر جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اگرچہ بات یہیں پر کامل ہو جاتی ہے پھر بھی ہم ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں کہ کیا عملی طور پر بھی ایسا ہوا ہے اور پیغمبرؐ نے علیؑ کو امام منصوص فرمایا ہے یا نہیں؟ چنانچہ یہاں سے نصوص کی بحث شروع ہوتی ہے۔

یہاں میں ایک بات عرض کرتا چلوں کہ ہم میں بعض کہتے ہیں کہ آخر ہمیں کلامی روش اپنانے کی کیا ضرورت ہے کہ اس بلندی سے مسئلہ شروع کریں؟ ہم نیچے ہی سے کیوں نہیں چلتے جہاں سے یہ مسئلہ وجود میں آیا ہے۔ متکلمین اوپر سے چلتے ہوئے یہاں تک پہنچتے ہیں لیکن اگر ہم اس مشرب کی بنیاد پر گفتگو کریں تو بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ امامت خدا کا لطف ہے یا نہیں، اور چونکہ لطف ہے اس لئے امام کو معصوم ہونا چاہئے اور جب معصوم ہے تو منصوص بھی ہونا چاہئے؟ یہ "چاہئے چاہئے" خدا کے فرائض مشخص کرنے کے مترادف ہے۔ ہم خدا کی ذمہ داریاں معین کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہمیں تو سیدھے سیدھے یہ دیکھنا چاہئے کہ پیغمبرؐ نے کسی کو منصوص فرمایا ہے یا نہیں؟ اگر فرمایا ہے تو یہی ہمارے لئے کافی ہے۔ اس کے لطف ہونے اور عصمت و تنصیص کو عقلاً ثابت کرنے کے بغیر بھی مسئلہ حل ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے کسی کو معین بھی کیا ہے یا نہیں؟ اب ہم یہ دیکھیں کہ شیعہ اس سلسلہ میں کیا استدلال پیش کرتے ہیں؟ ان دلائل کو ہم سربستہ ذکر کرنے پر مجبور ہیں، کیونکہ ان میں سے زیادہ تر دلیلوں کو اہل سنت آنحضرتؐ کی جانب سے نص کی صورت میں یا تو قبول نہیں کرتے (البتہ صاف انکار بھی نہیں کرتے بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ خبر واحد ہے متواتر نہیں ہے) یا پھر ان کے معانی و مفاہیم کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے وہ معنی نہیں جو آپ مراد لیتے ہیں۔

رسول اکرمؐ کی جانب سے علیؑ کی امامت پر نصوص کی تحقیق

پہلی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "سلّموا علی علیٍّ بامرة المؤمنین" علی کو امیر المومنین کی حیثیت سے سلام کرو۔ یہ جملہ واقعہ غدیر سے متعلق ہے۔ البتہ حدیث غدیر کے اس جملہ کو علاحدہ ذکر کرتے ہیں۔ اہل سنت اس جملہ کو متواتر حدیث کی شکل میں نہیں مانتے۔ بعد کے علماء شیعہ نے جو کام کئے ہیں ان میں یہی ثابت کیا ہے کہ اس طرح کی حدیثیں متواتر ہیں۔ تجرید میں مذکورہ عبارت سے زیادہ کچھ اور ذکر نہیں ہوا ہے اور یہ حدیث ارسال مسلم قرار دیا

گئی ہے۔ شارح (ملا علی قوشجی) بھی کہتے ہیں کہ ہم اسے قبول نہیں کرتے کہ یہ حدیث متواتر ہوگی، بلکہ یہ خبر واحد ہے۔ بعض نے اسے نقل کیا ہے، سب نے نقل بھی نہیں کیا ہے۔ "عبقات الانوار" اور "الغدیر" جیسی کتابوں میں ان حدیثوں کو متواتر ثابت کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں خصوصیت سے الغدیر میں حدیث غدیر کے ناقلین طبقہ بہ طبقہ پہلی صدی سے چودہ صدی تک ذکر کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں ساٹھ سے کچھ زیادہ نام اصحاب پیغمبرؐ کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں (یہ سب کے سب اہل سنت کی کتابوں سے مندرج ہیں) اس کے بعد تابعین کا طبقہ ہے جنھوں نے اصحاب سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ یہ لوگ تقریباً پہلی صدی سے مربوط ہیں۔ بعد کی صدیوں میں بھی طبقہ بہ طبقہ افراد کا ذکر ہے۔ "الغدیر" میں خاص طور سے جو کام انجام دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس واقعہ کے ادبی پہلو سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ بہت اہم کام ہے۔ "عبقات" اور اس طرح کی دوسری کتابوں میں زیادہ تر اس پر زور دیا گیا ہے کہ مختلف صدیوں میں کن کن لوگوں نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ لیکن "الغدیر" میں واقعۂ غدیر کے ادبی پہلو کو بھی اجاگر کرکے اس سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ ہر زمانہ میں جو خاص بات لوگوں میں مشہور ہوتی ہے شعراء اپنے اشعار میں اس کی عکاسی ضرور کرتے ہیں۔ شعراء ان ہی چیزوں کو اپنے اشعار میں منعکس کرتے ہیں جو ان کے زمانہ میں پائی جاتی ہیں۔ خود صاحب "الغدیر" کہتے ہیں کہ اگر اہل سنت کے مطابق غدیر کا مسئلہ چوتھی صدی ہجری کا مسئلہ ہوتا تو پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری میں شعراء نے اس موضوع پر اس قدر شعر نہ کہے ہوتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صدی میں مسئلہ غدیر اس عہد کے ادبیات کا جزو بنا ہوا ہے۔ بنا بر ایں ہم اس حدیث سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں، اور یہ تاریخی اعتبار سے واقعہ کے اثبات کی بہترین روش ہے۔ ہم اکثر و بیشتر کسی تاریخی واقعہ یا موضوع کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے شعراء و ادبا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ ہر صدی کے شعراء و ادبا نے اس موضوع کو اپنے ادبیات میں منعکس کیا ہے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ فکر ان لوگوں کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ صاحب "عبقات" نے بھی اکثر ایک حدیث پر پوری ایک کتاب لکھ ڈالی ہے اور اس میں راویوں کے ذکر کے ساتھ ان کی چھان بین کی ہے کہ یہ راوی معتبر ہے یا غیر معتبر، فلاں شخص نے یہ بات کہی ہے، صحیح ہے... گویا شجروں سے بھرا ہوا ایک توانا درخت کھڑا کر دیا ہے جسے دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس شخص نے کتنی تحقیق کی ہے۔

ایک اور جملہ جو پیغمبرؐ سے ہی نقل کیا گیا ہے۔ اس میں آنحضرتؐ نے علیؑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "انت الخلیفة بعدی" تم میرے بعد میرے خلیفہ ہو۔ ان دو جملوں کے علاوہ بھی اس ضمن میں اور بہت سے جملے ہیں۔

"سیرت ابن ہشام" ایک کتاب ہے جو دوسری صدی ہجری میں لکھی گئی ہے۔ خود ابن ہشام تو بظاہر تیسری صدی ہجری کے ہیں لیکن اصل سیرت ابن اسحاق کی ہے جو دوسری صدی کے اوائل میں موجود تھے۔ ابن ہشام نے ان ہی کی کتاب کی تلخیص و تدوین کی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس پر اہل سنت بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔ اس میں دو واقعے نقل ہیں جن کو (تجرید) میں تو نقل نہیں کیا گیا ہے لیکن چونکہ موضوع وہی ہے لہٰذا میں انھیں نقل کئے دیتا ہوں۔

دعوت ذوالعشیرہ

واقعہ یہ ہے کہ اوائل بعثت میں پیغمبر اکرمؐ پر آیت نازل ہوئی: "انذر عشیرتك الاقربین"[1] اے رسولؐ اپنے خاندان والوں کو ڈرایئے (دعوت اسلام دیجئے) پیغمبر اسلامؐ نے ابھی اس حیثیت سے عمومی تبلیغ و دعوت شروع نہیں کی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ اس وقت علیؑ کافی کم سن تھے اور پیغمبرؐ کے گھر میں ہی رہتے تھے (علیؑ بچپن سے ہی پیغمبر کے گھر میں ان کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے تھے جس کا ایک الگ واقعہ ہے) چنانچہ رسول اکرمؐ نے علیؑ سے فرمایا، کچھ کھانے کا انتظام کرو اور بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب کو دعوت دیدو۔ علیؑ نے گوشت سے غذا درست کی اور کچھ دودھ کا بھی انتظام کیا جسے کھانے کے بعد لوگوں نے پیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسلام کی دعوت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: میں خدا کا رسول ہوں اور خدا کی جانب سے مبعوث کیا گیا ہوں۔ مجھے مامور کیا گیا ہے کہ پہلے تم لوگوں کو دعوت حق دوں۔ اگر تم نے میری بات مانی تو دنیا و آخرت کی سعادت تمہارا نصیب ہوگی۔ ابولہب جو پیغمبرؐ کا چچا تھا، اس نے جب یہ جملہ سنا تو آگ بگولہ ہوگیا اور بولا، تم نے ہمیں اسی لئے بلایا ہے کہ ہم سے یہ فضول باتیں کہو؟ بہرحال اس نے ہنگامہ برپا کرکے جلسہ کو درہم برہم

[1] سورہ شعراء/۲۱۴

کردیا۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کو دوسری مرتبہ پھر دعوت کا انتظام کرنے اور لوگوں کو بلانے کا حکم دیا۔ خود امیرالمومنینؑ جو اس واقعہ کے راوی بھی ہیں، فرماتے ہیں، یہ لوگ تقریباً چالیس افراد تھے۔ دوسری مرتبہ پیغمبرؐ نے ان لوگوں سے فرمایا، تم میں سے جو شخص سب سے پہلے میری دعوت قبول کرے گا میرے بعد میرا وصی، وزیر اور جانشین ہوگا۔ علیؑ کے سوا کسی اور نے پیغمبرؐ کی بات کا مثبت جواب نہ دیا اور جتنی مرتبہ پیغمبرؐ نے اعلان کیا اتنی مرتبہ علیؑ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ آخر پیغمبرؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تم ہی میرے وصی، وزیر اور جانشین ہوگے۔

ایک سردار قبیلہ کی پیغمبر اکرمؐ سے ملاقات

دوسرا واقعہ کہ یہ بھی سیرت ابن ہشام میں ہے، مذکورہ واقعہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ وہ زمانہ جب پیغمبرؐ ابھی مکہ میں تھے اور قریش آپ کی تبلیغات میں اڑچنیں ڈالتے تھے۔ حالات بہت سخت اور دشوار تھے۔ پھر بھی یہ لوگ محترم[1] مہینوں میں پیغمبرؐ کو پریشان نہیں کرتے تھے یا کم از کم زیادہ اذیتیں نہیں دیتے تھے۔ یعنی جسمانی اذیتیں نہیں دیتے تھے لیکن تبلیغات میں رکاوٹیں ضرور پیدا کرتے تھے۔ رسول اکرمؐ ہمیشہ ان موقعوں سے فائدہ اٹھاتے اور جب لوگ عرفات کے بازار عکاظ میں جمع ہوجاتے (اس وقت بھی حج کیے جاتے تھے لیکن اس کا مخصوص انداز ہوا کرتا تھا) تو وہاں پہنچ کر مختلف قبائل کے درمیان گھوم گھوم کر لوگوں کو دعوت حق دیا کرتے تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس ہنگامہ میں ابولہب سایہ کی طرح پیغمبر کے پیچھے لگا رہتا تھا اور جو کچھ پیغمبرؐ فرماتے تھے وہ جواب میں لوگوں سے کہا کرتا تھا یہ (معاذ اللہ) جھوٹ بول رہے ہیں، ان کی باتوں میں نہ آنا۔ ایک قبیلہ کا سردار جو بہت ذہین اور چالاک تھا پیغمبرؐ سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اپنے قبیلہ والوں سے کہنے لگا، اگر یہ شخص ہم میں سے ہوتا تو "لا کلت بہ العرب" یعنی میں اس شخص میں وہ استعداد

[1] ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم چونکہ ماہ حرام تھے۔ لہٰذا یہ آزادی کے مہینے ہوتے تھے یعنی ان مہینوں میں جنگیں رک جاتی تھیں۔ دشمن ایک دوسرے سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ اور آپس میں آمد و رفت معمول پر آجاتی تھی۔ لوگ عکاظ کے بازار میں جمع ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اپنے باپ کے قاتل کو بھی پاجاتا تھا جس کی ایک مدت سے اسے تلاش رہی ہے، تو ان حرام مہینوں کے احترام میں اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔

دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ ہم میں سے ہوتا تو ہیں اس کے ذریعہ پورے عرب کو کھا جاتا"۔ چنانچہ اس نے پیغمبر اکرمؐ سے کہا کہ میں اور میری قوم آپ پر ایمان لانے کے لئے تیار ہیں (بلاشبہ ان کا ایمان حقیقی ایمان نہ تھا) لیکن ایک شرط ہے: آپ بھی ہم سے یہ وعدہ کیجئے کہ اپنے بعد کے لئے مجھے یا ہم میں سے کسی شخص کو اپنا نائب و وصی معین کریں گے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا میرے بعد کون میرا جانشین ہوگا یہ مجھ سے مربوط نہیں ہے۔ اس کا تعلق خدا سے ہے (یعنی وہ جسے چاہے گا میرا جانشین مقرر کرے گا) یہ وہ بات ہے جو اہل سنت کی تاریخی کتابوں میں ذکر ہوئی ہے۔

حدیث غدیر اور اس کا متواتر ہونا

ایک اور دلیل جسے شیعوں نے ذکر کیا ہے حدیث غدیر ہے۔ (خواجہ نصیرالدین) فرماتے ہیں:

"والحدیث الغدیر المتواتر" حدیث غدیر، جو متواتر ہے۔ "متواتر" علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے کہتے ہیں خبر واحد اور خبر متواتر۔ خبر واحد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا ناقل کوئی ایک شخص ہو بلکہ اس سے مراد ایسی خبر یا حدیث ہے جس کا نقل کیا جانا یقین کی حد کو نہ پہنچا ہو یعنی اس کے سننے سے یقین نہ پیدا ہوتا ہو۔ چاہے اس کا ناقل ایک ہو یا دس ہوں۔ مثال کے طور پر ایک شخص آپ سے بیان کرتا ہے کہ میں نے فلاں خبر ریڈیو سے سنی ہے۔ آپ کو گمان تو ہو جاتا ہے کہ یہ بات صحیح ہوگی۔ لیکن ابھی آپ منتظر ہیں کہ دیکھیں دوسرے کیا کہتے ہیں۔ وہی بات آپ دوسرے سے سنتے ہیں۔ آپ کا گمان اور قوی ہو جاتا ہے۔ بعد میں آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ وہی بات کہہ رہے ہیں اب آپ یہ احتمال نہیں دے سکتے کہ یہ سب کے سب جھوٹ بول رہے ہوں گے۔ حتیٰ خبر (نقل یا بیان کرنے والوں) کی تعداد اس قدر ہو کہ سب کے سب کا جھوٹ بولنے کا خیال ہی درست نہ ہو، کیونکہ ایک حد تک تو ممکن ہے چند افراد کسی بات پر اتفاق کرلیں۔ لیکن اگر اس حد سے زیادہ ہوں تو باہم اتفاق کر لینے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ تواتر کے معنی یہ ہیں کہ (نقل خبر کی تعداد) آپس میں اتفاق کر لینے کی امکانی حد سے کہیں زیادہ ہو۔ مثلاً اسی مذکورہ مثال میں یہ تو ممکن ہے کہ دس آدمی باہم تفاہم کر کے کہیں کہ ہم نے فلاں خبر ریڈیو سے سنی ہے۔ یہ تعداد دو سو افراد تک بھی ممکن ہے۔ لیکن اگر قضیہ اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ اس میں اتفاق و باہمی تفاہم کا احتمال یا امکان ہی نہیں رہ جاتا۔ مثلاً آپ تہہ کے

جنوب میں چلے جائیں اور وہاں آپ سے کوئی کہے کہ ریڈیو نے فلاں خبر دی ہے، پھر آپ مشرق میں جائیں وہاں بھی کچھ افراد اسی خبر کو نقل کرتے ہوئے نظر آئیں۔ یوں ہی آپ مغرب و شمال میں جائیں اور وہاں بھی وہی بات سنیں اب آپ یہ احتمال نہیں دے سکتے کہ سب نے آپس میں تفاہم کر کے ایک بات کہی ہے اسی کو تواتر کہتے ہیں۔ شیعہ اس کے دعویدار ہیں کہ حدیث غدیر اس قدر نقل ہوئی ہے کہ اس میں باہمی تفاہم یا تبانی کا امکان ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مثلاً اصحاب پیغمبرؐ میں سے چالیس افراد نے باہم ایکا کر کے ایک جھوٹی بات گڑھ لی ہے۔ خصوصاً جبکہ اس خبر کے بہت سے نقل کرنے والے دشمنانِ علیؑ میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ یا اگر دشمن نہیں ہیں تو ان کے طرفدار بھی شمار نہیں ہوتے۔ اگر اس حدیث کے نقل کرنے والے صرف سلمان، ابوذر اور مقداد جیسے افراد ہوتے جو علیؑ کے گرد سایہ کی طرح موجود رہتے تھے، تو کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ یہ افراد علیؑ سے بے انتہا محبت رکھتے ہیں لہٰذا ان سب نے مل جل کر ایک بات کہدی ہے۔ جبکہ اس خبر کے نقل کرنے والے ایسے افراد ہیں جن کو علیؑ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ملا علی قوشجی وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ خبر واحد ہے متواتر نہیں ہے۔ جبکہ شیعہ کہتے ہیں کہ نہیں یہ خبر متواتر ہے اور دلیل میں کتابیں پیش کرتے ہیں۔

حدیث غدیر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الست اولیٰ بکم من انفسکم؟[1] قالوا بلیٰ" کیا میں تم سب سے زیادہ خود تم پر اولویت نہیں رکھتا؟

سب نے مل کر کہا: ہاں یا رسول اللہ، تو آپؐ نے فرمایا: من کنت مولاہ فھذا علیٌ مولاہ، ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ اس حدیث کے ذریعہ علیؑ کے لئے لوگوں پر اپنی ہی جیسی اولویت کا اعلان کر رہے ہیں۔

حدیث منزلت

یہ حدیث جسے خواجہ نصیر الدین طوسی متواتر فرماتے ہیں اور ملا علی قوشجی اس سے ایک دم انکار تو نہیں کرتے البتہ اسے خبر واحد قرار دیتے ہیں۔ اس پر بھی میر حامد حسین نے عبقات میں اور علامہ

---

[1] یہاں پیغمبر اسلامؐ کا اشارہ قرآن کے (سورۂ احزاب، آیت نمبر ٦) کی طرف ہے جس میں ارشاد ہے: النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم ←

امینی نے الغدیر میں اور خاص طور سے میر حامد حسینؒ نے پوری ایک جلد میں بحث کی ہے۔ (صاحب الغدیر نے حدیث غدیر کے علاوہ دوسری حدیثوں پر زیادہ کام نہیں کیا ہے) اس حدیث کو حدیث منزلت کہتے ہیں، جس میں پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی" تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے یہ جملہ اس وقت فرمایا جب آپ غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔ غزوۂ تبوک کوئی جنگ نہ تھی بلکہ صرف ایک لشکر کشی تھی۔ یہ لشکر کشی غزوۂ موتہ کے بعد عمل میں آئی، جو عرب اور رومیوں کے درمیان عہد پیغمبرؐ میں پہلی اور آخری جنگ تھی۔ اور مدینہ کے شمال میں لڑی گئی تھی۔ مشرقی روم کی شہنشاہیت کا مرکز اسلامبول یعنی (قسطنطنیہ) تھا۔ شام کا علاقہ بھی ان ہی کی حمایت اور سرپرستی میں تھا۔ رومی شام میں جمع ہو کر مدینہ پر حملہ کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے مناسب سمجھا کہ روم کی سرحد تک ایک لشکر کشی کی جائے چنانچہ آپ نے یہ اقدام فرمایا جو غزوہ تبوک کے نام سے مشہور ہے۔

سیاست دانوں کے بقول پیغمبرؐ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے روم کی سرحد تک تشریف لے گئے تھے کہ ادھر ہم بھی آمادہ ہیں اور پھر واپس ہو لئے۔ آنحضرتؐ اس سفر میں علیؑ کو اپنے ہمراہ نہیں لے گئے بلکہ آپ کو مدینہ میں اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گئے تھے۔ علمائے شیعہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یہ اقدام اس وجہ سے فرمایا تھا کہ جانتے تھے کوئی جنگ نہیں لڑی جائے گی۔ علیؑ جب مدینہ میں اکیلے رہ گئے تو بہت افسردہ اور دل تنگ ہوئے آپ نے آنحضرتؐ سے عرض کی: یارسول اللہ! آپ مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاکر یہاں عورتوں اور بچوں کے درمیان چھوڑے جارہے ہیں؟ اس پر حضرت نے فرمایا: "اما ترضی ان تکون (یا: انت) منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی"

پیغمبرؐ کا تعلق چونکہ خدا کی ذات سے ہے لہٰذا وہ تمام لوگوں کی جان و مال پر ان سے زیادہ اولویت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ہر شخص اپنے مال اور اپنی جان کا خود مختار ہے لیکن وہ ہر صاحب اختیار سے زیادہ با اختیار ہیں۔ البتہ معاذاللہ پیغمبرؐ کبھی کوئی کام اپنے ذاتی نفع کے تحت انجام نہیں دیتے۔ وہ خداوند عالم کی طرف سے اسلامی معاشرہ کے نمائندہ ہیں۔ یہاں عام لوگوں اور پیغمبرؐ میں فرق یہ ہے کہ لوگ اپنی جان و مال کے مختار اپنی ذات کے لئے ہیں جبکہ پیغمبرؐ اسلامی معاشرہ کی فلاح کے تحت یہ اختیار رکھتا ہے۔

(گویا آپؐ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے تم کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔ یوں ہی چھوڑے نہیں جا رہا ہوں) یعنی سوائے نبوت کے جو جو نسبت ہارون کو موسیٰ سے تھی وہ تمہیں مجھ سے ہے، جب ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے درمیان نسبتوں کا جائزہ لینے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ موسیٰ ابتدائے کار میں ہی یعنی پیغمبری عطا کئے جانے کے فوراً بعد خدا سے یہ درخواست کرتے ہیں:

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی (یہاں تک تو صرف اپنے لئے دعا ہے۔ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی ربط نہیں ہے) واجعل لی وزیراً من اھلی (اصل میں وزیر کے معنی بھارے اور مددگے ہیں، وزر یعنی بوجھ، سنگینی، وزیر یعنی جو ایک حد تک بوجھ بٹائے۔ یہ اصطلاح بھی بعد میں اسی لئے مشہور اور رائج ہوئی کہ وزیر بادشاہ کا معاون ہوا کرتا ہے) اے معبود! میرے لئے میرے خاندان سے معاون و مددگار معین فرما۔ پھر خود ہی پیشکش کرتے ہیں۔ "ھارون اخی" میرے بھائی ہارون کو (میرا وزیر معین کردے)" اشدد بہ ازری" اور اس کے ذریعہ سے میری پشت محکم کردے۔ "واشرکہ فی امری" اور اسے اس کام میں میرا شریک قرار دے۔ "کی نسبحک کثیرا ونذکرک کثیراً" تاکہ ہم دونوں بیش از بیش تیری تسبیح پڑھیں اور تجھے یاد کریں۔ یعنی تیرے دین کو زیادہ سے زیادہ رواج بخشیں۔[1]

دوسری جگہ قرآن (مذکورہ واقعہ کے بعد) فرماتا ہے کہ موسیٰ نے ہارون سے کہا: "یا ھارون اخلفنی فی قومی"[2] اے ہارون! میری قوم میں میرے جانشین بن کر رہو۔

چنانچہ جب پیغمبرؐ فرماتے ہیں: "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" تو اس سے حضرتؐ کی مراد یہ ہے کہ وہ تمام نسبتیں جو قرآن کی روشنی میں ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھیں (مثلاً ان کے وزیر تھے، ان کی پیٹھ ان سے محکم تھی، شریک کار تھے، اور ان کی قوم میں ان کے جانشین تھے) وہ سب تمہیں مجھ سے ہیں الا انہ لا نبی بعدی یعنی سوائے نبوت کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اگر پیغمبر اکرمؐ الا انہ لا نبی بعدی نہ فرماتے تو یہ کہا جاتا کہ پیغمبرؐ نے کسی ایک پہلو یا کسی مخصوص شباہت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لیکن جب آپ صرف نبوت کا استثناء فرماتے ہیں تو گویا آپ یہ

[1] سورۂ طٰہٰ آیت ۲۵ سے ۳۲۔

[2] سورۂ اعراف، آیت نمبر ۱۴۲۔ پوری آیت یوں ہے: "قال موسیٰ لاخیہ ھارون اخلفنی فی قومی"۔

کہنا چاہتے ہیں کہ تمام پہلوؤں میں یہ نسبت برقرار ہے (البتہ تمام اجتماعی مراحل میں، طبیعی و فطری نسبت کے تحت نہیں کہ موسیٰؑ و ہارونؑ بھی بھائی تھے۔ تم اور ہم بھی بھائی ہیں!) بلکہ جو نسبت ہارونؑ کو خدا کی طرف سے موسیٰؑ کے ذریعہ تمام مراحل میں حاصل تھی، وہی تمہیں مجھ سے حاصل ہے۔

اہل سنت اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر ایسی کوئی حدیث متواتر ہوتی تو ہم مان لیتے لیکن یہ متواتر نہیں ہے بلکہ خبر واحد ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میر حامد حسینؒ جیسے علماء نے اپنی کتابوں میں اہل سنت کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے۔

سوال و جواب

سوال: گزشتہ جلسہ کی اختتامی اور آج کے جلسہ کی ابتدائی گفتگو سے جو نتیجہ میں نے اخذ کیا ہے۔ اس نے میرے ذہن میں حکومت و امامت کے درمیان ایک طرح سے حد بندی کی لکیر کھینچ دی ہے اور وہ اس طرح کہ آقای مطہریؒ نے فرمایا کہ امامت کے کچھ فرائض ہیں جن کا ایک شعبہ حکومت بھی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ حکومت کے علاوہ اس کے دوسرے کون سے شعبے ہیں جن میں حکومت شامل اور دخیل نہیں ہے ہم اب تک اسلام سے جو کچھ سمجھے ہیں وہ یہ کہ ہماری دنیا و آخرت یا دنیوی و اخروی اعمال کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ جو کچھ اخروی اعمال کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے وہ ہمارے دنیادی اعمال کی ضمانت بن کر خود ہماری زندگی میں دخیل ہے اور ہمارے دنیادی اعمال ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کو ارتقاء و کمال کی طرف لے جاتے ہیں، ساتھ ہی معاشرہ میں ایک اجتماعی حکومت برقرار کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بھی ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ خدا ان ہی کو بلند مقام عطا کرتا ہے جو اپنے عبادی اعمال کے ذریعہ اپنی دنیوی زندگی کو سنوارتے ہیں عدل و انصاف کی حاکمیت قائم کرنے میں کوشاں رہتے ہیں اور قرآن میں جہاد کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ائمہ علیہم السلام کی زندگی میں بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں ان کے تمام ارشادات اور ان کی پاکیزہ سیرتیں یہ ظاہر کرتی رہی ہیں کہ یہ حضرات اپنے حقوق، حق حاکمیت اور حکومت حاصل کرنے کی مسلسل جد و جہد کرتے رہے۔ چاہے وہ اعلانیہ جہاد کرتے رہے یا قیدخانوں اور مخفی گاہوں میں خاموشی کے ساتھ ان تحریکوں کی سربراہی کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ میں امامت کے لئے حکومت کے علاوہ دوسرے فرائض کی توجیہ نہیں کر پاتا کیونکہ ان کی حکومت ہی امامت کے تمام اعمال کی توجیہ کر سکتی ہے۔ برائے

مہربانی وضاحت فرمادیں؟

جواب: حد بندی کی بات تو آپ نے خود اٹھائی ہے، میں نے اس لفظ کا ہی استعمال نہیں کیا اور نہ اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ امامت شیعوں کے یہاں حکومت سے بھی بالاتر ایسا مرتبہ ومقام ہے جس کا ایک پہلو حکومت بھی ہے۔ اور وہ اعلیٰ منزلت معصوم و بے خطا ہونے کی حیثیت سے اسلام بیان کرنا اس کی وضاحت کرنا اور احکام دین کے لئے ان کا مرجع و منبع قرار پانا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی ایک شان حکومت وحاکمیت بھی تھی۔ یہ تو کوئی حد بندی نہیں ہوئی۔ پیغمبر اکرمؐ لوگوں پر حاکم تھے لیکن یہ حکومت انسانوں کی طرف سے ان کو نہیں ملی تھی اور نہ انسانوں نے انھیں یہ حق دیا تھا۔ بلکہ یہ خدادادحق تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں میں سب سے مافوق اور بلند تھے (دوسرے لفظوں میں پیغمبرؐ تھے) کیونکہ احکام الٰہی کے بیان کرنے والے اور عالم غیب سے معنوی رابطہ رکھنے والے تھے۔ میں نے نہ تو دنیا و آخرت کے درمیان کسی فاصلہ یا حد بندی کا اظہار کیا ہے اور نہ ہی حاکم وامام کے درمیان کسی جدائی کا قائل ہوں کہ یہ کہوں، امام لوگوں کی آخرت کا ذمہ دار ہے اور حاکم لوگوں کی دنیا کے لئے ہے۔ اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو آپ کا اعتراض بجا تھا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ شیعوں کے یہاں امامت کا مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ اگر وہ ثابت ہوجائے تو حکومت خود بخود ثابت ہو جائے گی۔ ہم دراصل نبوت کی ایسی جانشینی کے قائل ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی حکومت کا سوال ہی نہیں اٹھتا، جس طرح پیغمبرؐ کی موجودگی میں کسی غیر کی حکومت کی بات مہمل ہے، اسی طرح شیعوں کے یہاں بیان شدہ امام کی موجودگی میں کسی دوسرے کی حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آج کل رائج معنی کے مطابق حکومت اسی وقت ممکن ہے جب ہم فرض کرلیں کہ دنیا میں کوئی امام موجود ہی نہ ہو یا ہمارے زمانہ کی طرح امام پردۂ غیب میں ہو۔ ورنہ امام کی موجودگی اور اس کے ظہور کے وقت شیعہ جس سطح کی امامت کے قائل ہیں حکومت کا مسئلہ خود بخود روشن اور حل شدہ ہے۔

سوال: اہل سنت غدیر خم والی روایت کو خبر واحد قرار دیتے ہیں اور متواتر نہیں جانتے یا آپ کی بیان کردہ اس روایت کو جس میں رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ: علی کو سلام کرو کیوں کہ وہ تمہارے امیر ہیں؟

جواب: روایت غدیر کے اس فقرہ من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کے سلسلہ میں

توشاید اہل سنت بھی اس کے متواتر ہونے سے انکار نہیں کر سکتے ۔ اگرچہ ملا علی قوشچی یہی کہتے ہیں کہ یہ جملہ بھی متواتر نہیں ہے ۔ دراصل یہ جملہ اتنا زیادہ نقل ہوا ہے کہ اہل سنت کو بھی اس کے (تواتر سے) انکار کی مجال نہیں ہے۔[1] بہت سے لوگوں نے اس روایت کے پہلے حصہ کو بھی نقل کیا ہے جس میں پیغمبرؐ فرماتے ہیں: "الست اولیٰ بکم من انفسکم" شیعہ اس حصہ کو بھی متواتر جانتے ہیں ۔ لیکن حدیث :"سلموا علی علی بامرۃ امیر المومنین" کے تواتر کو اہل سنت کسی صورت سے قبول نہیں کرتے بلکہ اسے خبر واحد کہتے ہیں ۔ اور شاید ہم بھی اس کے متواتر ہونے کو پورے طور سے ثابت نہ کر پائیں (میں اس سلسلہ میں زیادہ نہیں جانتا) اور کوئی ضروری بھی نہیں ہے ۔ لیکن اس حدیث کا اصل حصہ کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: "الست اولیٰ بکم من انفسکم" اور لوگوں نے عرض کیا "بلیٰ" ہاں یا رسول اللہؐ[2] ۔ اس کے بعد حضرتؐ نے فرمایا: من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ ۔

اس کا تواتر ہماری نظر میں واضح اور بدیہی ہے ۔ جبکہ اہل سنت اس سلسلہ میں اختلاف نظر رکھتے ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حدیث متواتر ہے ، بعض کہتے ہیں کہ خبر واحد ہے ۔ اور بعض اسے متواتر تو جانتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو شیعہ بیان کرتے ہیں بلکہ اس میں پیغمبرؐ نے یہ فرمایا ہے کہ جو شخص مجھے دوست رکھتا ہے وہ علیؑ کو بھی دوست رکھے ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ کونسی بات ہے کہ پیغمبرؐ غدیر خم میں لوگوں کو جمع کریں اور فرمائیں کہ جو مجھے دوست رکھتا ہے علیؑ کو بھی دوست رکھے! آخر یہ کون سی خاص بات ہوئی کہ علیؑ کو صرف دوست رکھو؟! جبکہ اس سے قبل خود حضرتؐ فرما چکے ہیں: "الست اولیٰ بکم من انفسکم" کلمۂ مولا بنیادی طور پر کسی بھی جگہ دوست کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے ۔

سوال : کیا آیت: "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً" واقعہ غدیر کے بعد نازل ہوئی ہے؟

جواب : نہیں ، غدیر خم ہی میں نازل ہوئی ہے ۔

[1] اس جملہ کے بہت زیادہ نقل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے زمانہ میں آنحضرتؐ کے اقوال اسی وقت لکھ کر محفوظ نہیں کئے جاتے تھے بلکہ ذہنوں میں محفوظ کر لئے جاتے تھے ۔ لہٰذا فطری طور پر اس حدیث کا وہی جملہ سب سے زیادہ یاد رہا جس میں علیؑ کا نام موجود تھا: من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ

[2] سفینۃ البحار ۔ جلد ۲ ، ص ۳۰۶

گزشتہ بحث میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ مسئلہ امامت کے سلسلہ میں شیعہ اور اہل سنّت کے نظریوں کی بنیاد ایک دم الگ ہے۔ اور یہ دونوں نظریے بنیادی طور سے مختلف ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں یہ بحث کرنا ہی غلط ہے کہ ہم بھی امامت کے قائل ہیں اور وہ بھی، لیکن امامت کے شرائط میں ہم دونوں کے نظریوں میں فرق ہے۔ کیونکہ شیعہ امامت سے جس مرتبہ و منصب کے قائل ہیں وہ اس سے بالکل جدا ہے جس کے امامت کے نام پر اہل سنت معتقد ہیں۔ اسی طرح جیسے اس مسئلہ کو یوں اٹھانا صحیح نہیں ہے کہ امامت نص کے ذریعہ معین ہوتی ہے یا شوریٰ کے ذریعہ؟ یعنی امام کی تعیین پیغمبرؐ کو کرنی چاہئے یا لوگوں کو اس کے انتخاب کا اختیار ہے"۔ کیونکہ امامت کے سلسلہ میں شیعہ جو عقیدہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام نص کے ذریعہ معین ہوتا ہے وہ اس سے ایک دم الگ ہے جس کا اہل سنت اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا انتخاب شوریٰ سے ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دونوں ایک ہی چیز کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور ایک کہتا ہے کہ یہ نص کے ذریعہ ہے، دوسرا کہتا ہے شوریٰ کے ذریعہ اصل میں کہنا یہ چاہئے کہ شیعہ کی نظر میں امامت سے مراد جو کچھ ہے اہل سنت اسے سرے سے قبول ہی نہیں کرتے، صرف اس کے شرائط ہی میں اختلاف نہیں رکھتے۔ اس کی مثال بالکل منکرین نبوت کے نزدیک نبوت کے مانند ہے۔ شیعہ امامت سے وہ بلند و بالا مقام مراد لیتے ہیں کہ فطری طور پر اگر کوئی اس مقام کا تصور کرلے اور اسے قبول کرلے تو بہر حال اسے ماننا ہی پڑے گا کہ امام کو

چوتھی بحث

آیت: الیوم یئس... اور مسئلہ امامت

خدا کی جانب سے معین کیا جانا چاہئے۔ جس طرح نبوت کے سلسلہ میں کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ لوگ بیٹھ کر نبی منتخب کرلیں۔ اسی طرح شیعی نقطۂ نظر سے امام کی جو حیثیت و منزلت ہے، اس کے لئے بھی یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ لوگ مل بیٹھ کر ایسے کسی شخص کا انتخاب کرلیں۔

گزشتہ بحث میں ہم شیعی نقطۂ نظر سے امامت کے مراتب و شرائط کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے کہ شیعہ اس مسئلہ کو اوپر سے شروع کرتے ہیں (یعنی خدا سے) اور وہاں سے زینہ بہ زینہ نیچے آتے ہیں اس کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بات صرف ایک مفروضہ ہی نہ رہ جائے لہٰذا دیکھنا چاہئے کہ ہم امامت کے سلسلہ میں جو اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، کیا پیغمبر اکرمؐ نے بھی کسی کو اس مقام کے لئے معین فرمایا ہے؟ اور قرآن بھی اس سلسلہ میں کچھ فرماتا ہے یا نہیں؟

پہلے یہ خیال تھا کہ اسی ترتیب کے ساتھ گفتگو کو آگے بڑھاؤں جس ترتیب سے خواجہ نصیر الدین نے اپنی کتاب تجرید میں اس مسئلہ کو پیش کیا ہے، لیکن چونکہ عید غدیر نزدیک ہے لہٰذا طے کیا کہ بہتر ہے پہلے غدیر سے مربوط آیات پر ہی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

آیہ الیوم یئس الذین ... کی تحقیق

سورۂ مائدہ کے شروع میں یہ آیت مذکور ہے: الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً[1] "آیت کے یہ دونوں حصے جو "الیوم" سے شروع ہوتے ہیں ایک ہی آیت کے ضمن میں ہیں۔ اور قدر مسلم یہ ہے کہ دونوں ایک ہی مطلب سے مربوط ہیں نہ کہ دو الگ الگ مطالب سے۔ پہلے اس آیت کا ترجمہ عرض کردوں پھر قرآن کے لحاظ سے اس کی شرح و تفسیر بھی کروں گا۔

لفظ "یوم" یعنی روز جب "الف ولام" کے ساتھ ذکر ہوتا ہے (الف ولام عہد کے ساتھ) تو کبھی "اُس روز" کے معنی دیتا ہے اور کبھی "آج" کے معنی ظاہر کرتا ہے۔ "اس روز" کے معنی میں وہاں استعمال

---

[1] سورۂ مائدہ/آیت ۳

ہوتا ہے جہاں پہلے ایک روز کا ذکر ہو چکا ہو ۔ بعد میں الیوم کہیں تو وہاں "اس روز" مراد ہوگا۔ اور اگر کہیں مثلاً الیوم فلاں شخص آیا تو یہاں اس سے مراد آج ہوگا۔ الیوم یئس الذین کفروا من دینکم (ابھی ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سے مراد اس روز ہے یا آج۔ اس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے) اس روز یا آج کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے۔ فلا تخشوھم لہٰذا اب ان سے کوئی خوف محسوس نہ کرو۔

تمہارے دین سے ان کے مایوس ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ تمہارے دین پر غلبہ پانے اور اسے نیست و نابود کرنے سے مایوس ہو گئے ۔ اور چونکہ مایوس ہو گئے لہٰذا اسلام مخالف اپنی گزشتہ ریشہ دوانیوں سے بھی دست بردار ہو گئے ۔ اب ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بعد کا جملہ بہت عجیب ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : "واخشونِ" اور مجھ سے ڈرو ۔ یعنی کہا یہ جا رہا ہے کہ اب کفار کی طرف سے ڈرنے کی ضرورت نہیں لیکن میری طرف سے خوف زدہ رہو جبکہ بات خود دین کی ہو رہی ہے۔ کفار کی طرف سے خوف کا مطلب تو یہ تھا کہ ان سے دین کو کوئی گزند نہ پہنچے، ان کے لئے تو خدا فرماتا ہے نہ ڈرو اب وہ کچھ نہیں کر سکتے "واخشونِ" لیکن مجھ سے ڈرو ۔ فطری طور پر معنی تو یہی ہوں گے کہ اب اگر دین کو کوئی گزند پہنچے گا تو میری طرف سے پہنچے گا ۔ آخر یہ کون سا مفہوم ہے کہ آج کے بعد سے اپنے دین کے لئے کفار سے نہ ڈرو ، بلکہ مجھ سے ڈرو ۔ اس سے کیا مقصود ہے اسے بعد میں ذکر کروں گا ۔

پھر ارشاد ہوتا ہے : "الیوم اکملت لکم دینکم" اس روز (یا آج) میں نے تمہارے دین کو کامل کیا یعنی حد کمال پر پہنچا دیا ۔ "واتممت علیکم نعمتی" یعنی اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا ۔ یہاں دو قریب المعنی لفظ ذکر ہوئے ہیں : "اکمال" و "اتمام" یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں یعنی میں نے کامل کیا یا تمام کیا ۔

اکمال اور اتمام کا فرق

(فارسی میں اور خصوصاً عربی میں) ان دونوں لفظوں کا باہمی فرق یہ ہے کہ "اتمام" اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی چیز کے اجزا یکے بعد دیگرے آتے ہیں جب تک تمام اجزا نہ آجائیں اس چیز کو ناقص کہتے ہیں اور جب اس کا آخری جزو بھی آجاتا ہے تو کہتے ہیں وہ چیز تمام ہو گئی مثلاً ایک

قرائن سے "وہ روز" سمجھا نہیں جا سکتا۔ ایک موقع ہے جب آیت سے پہلے کسی بہت اہم واقعہ یا حادثہ کا ذکر ہوا ہو اور بعد میں اسی حادثہ یا واقعہ کی مناسبت سے "آج" کہا جائے۔ یہاں ایسا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت سے پہلے بڑے عام اور سادہ سے احکام بیان کئے گئے ہیں کہ کس جانور کا گوشت تم پر حلال ہے اور کس کا حرام ہے۔ مردار کا حکم کیا ہے۔ خون اور سور کا گوشت تم پر حرام ہے وغیرہ وغیرہ اور پھر اچانک ارشاد ہوتا ہے: الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا اس آیت کے تمام ہونے کے بعد ہی دوبارہ گزشتہ مطالب کا بیان شروع ہو جاتا ہے کہ کون سا گوشت تم پر حرام ہے اور اضطرار و مجبوری کی حالت میں اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے: فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانف ... یعنی ان آیات کا سلسلہ کچھ ایسا ہے کہ اگر ہم زیر بحث آیت کو درمیان سے ہٹا بھی دیں تو اس کے ماقبل اور مابعد کی آیتیں آپس میں مربوط ہو جائیں گی اور کوئی معمولی سا خلل یا خلا بھی نظر نہ آئے گا۔ جیسا کہ اسی مضمون کی آیتیں مذکورہ آیت کے درمیان میں لائے بغیر قرآن میں مزید دو تین جگہ ذکر ہوئی ہیں اور مفہوم و مطلب بھی ایک دم کامل ہے کہیں سے کوئی نقص یا خلا ظاہر نہیں ہوتا۔

"الیوم" سے مراد کون سا روز؟

یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر شیعہ اور سنی دونوں مفسرین اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ "الیوم" سے مراد کون سا روز ہے؟ اس حقیقت کو معلوم کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم قرائن کے ذریعہ سمجھیں یعنی مضمون کے قرینہ سے دیکھیں کہ یہ مضمون کس روز پر چسپاں ہوتا ہے؟ اور کس روز سے متعلق ایسی اہم بات بیان کی جا سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ تاریخ و حدیث کے ذریعہ سمجھیں کہ اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟ جو لوگ پہلی راہ کا انتخاب کرتے ہیں وہ تاریخ و سنت و حدیث کے ذریعہ آیت کے شان نزول موقع و محل اور اس کی مناسبت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے آیت کے مضمون کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ آیت زمانہ بعثت سے مربوط ہے۔ لہذا "الیوم" سے مراد "اس روز" ہے نہ کہ "آج"۔

یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ یہ سورۂ مائدہ کی ابتدائی آیتیں ہیں اور یہ سورہ قرآن کا پانچواں

سورہ ہے جو "یاایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود" سے شروع ہوتا ہے۔ اور تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۂ مائدہ پیغمبرؐ پر نازل ہونے والا آخری سورہ ہے یعنی مدنی سورہ ہے۔ حتیٰ سورۂ اذاجاء نصراللہ والفتح" کے بعد نازل ہوا ہے۔ البتہ مفسرین کے مطابق ایک دو آیتیں اس سورہ کے بعد بھی نازل ہوئی ہیں جنہیں دوسرے سوروں میں شامل کر دیا گیا، لیکن یہ طے ہے کہ اس سورہ کے بعد کوئی سورہ نہیں نازل ہوا اور اس سورہ میں وہ آیتیں ہیں جو آخر آخر پیغمبرؐ پر نازل ہوئی ہیں۔

"الیوم" سے متعلق مختلف نظریات

۱۔ روزِ بعثت : ہم عرض کر چکے ہیں کہ بعض مفسرین کے نزدیک "الیوم" سے مراد "اُس روز" ہے نہ کہ "آج"۔ جب ان سے سوال ہوتا ہے کہ اس کا قرینہ کیا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ قرآن "الیوم" کہہ کر ایک روز کی اس قدر تعریف و توصیف کرتا ہے "کہ اس روز میں نے اسلام کو ایک دین کے عنوان سے تمہارے لئے پسند کر لیا" لہٰذا قاعدتاً یہ بعثت پیغمبرؐ کا روز ہی ہونا چاہئے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ آپ اپنی بات کے لئے "رضیت لکم الاسلام دیناً" کو قرینہ بنا رہے ہیں، یہ قرینہ اس وقت درست ہوتا جب اس سے پہلے کے جملے اس میں موجود نہ ہوتے۔ کیونکہ اصل میں بات یہ کہی جا رہی ہے کہ آج میں نے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا (جبکہ) روزِ بعثت اس نعمت کے شروع ہونے کا پہلا روز تھا۔ اور "رضیت لکم الاسلام دیناً" بھی اس وجہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ اب جبکہ اسلام کامل ہو گیا اور اسلام کی نعمت اتمام کو پہنچ گئی تو میں نے اس "دین" کو جیسا میں چاہتا تھا تمہارے لئے پسند کر لیا۔ اس اعتبار سے "الیوم" روزِ بعثت نہیں ہو سکتا۔

۲۔ روزِ فتح مکہ : روزِ بعثت کے بعد جس دوسرے روز کا احتمال دیا جاتا ہے (البتہ اس میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا، صرف ایک احتمال ہی ہے، اور چونکہ بیان کیا گیا ہے لہٰذا ہم بھی نقل کر رہے ہیں) وہ روزِ فتح مکہ ہے۔ کہتے ہیں کہ تاریخ اسلام میں ایک اور روز بھی بہت زیادہ اہم ہے (اور صحیح بھی ہے کہ فتح مکہ تاریخ اسلام کا بہت اہم دن ہے) اور وہ فتح مکہ کا روز ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی: "انّا فتحنا لک فتحاً مبیناً لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر"[1]

---

[1] سورۂ فتح، آیات نمبر ۱ و ۲

مکہ جزیرۃ العرب میں روحانی و معنوی حیثیت سے ایک عجیب منزلت کا حامل تھا۔ عام الفیل کے بعد یعنی جس سال اصحاب فیل نے مکہ پر حملہ کیا اور اس عجیب و غریب انداز سے شکست سے دوچار ہوئے۔ جزیرۃ العرب کے تمام لوگ کعبہ کو ایک عظیم عبادت گاہ کی حیثیت سے بڑی ہی گہری عقیدت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ اسی وجہ سے قریش میں غرور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ قریش اس (واقعہ) کا سہرا اپنے سر باندھتے تھے اور کہتے تھے" دیکھو یہ کعبہ ہے جو اس قدر محترم ہے کہ اتنا عظیم لشکر جب اسے ڈھانے آیا تو اس بری طرح آسمانی بلاؤں میں گرفتار ہو کہ ان میں کا ایک شخص بھی بچ نہ سکا دیکھو! ہم کس قدر اہم اور باعظمت ہیں! اسی کے بعد قریش میں عجیب غرور و نخوت کا احساس پیدا ہو گیا۔ اور عرب کے دوسرے قبائل میں بھی ایک طرح سے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی کیفیات پیدا ہو گئیں۔ مکہ کے بازار کو بڑی شہرت حاصل ہوئی چنانچہ قریش جو جی چاہتا تھا لوگوں پر حکم لگایا کرتے تھے اور لوگ بھی کعبہ سے اپنے اسی روحانی احساس و اعتقاد کی بنا پر بے چون و چرا ان کی اطاعت کرتے تھے۔

واقعۂ فیل کے بعد لوگوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ کعبہ اس قدر عظیم ہے کہ اب اس پر کسی کا قبضہ یا تسلط ہونا محال ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ کو فتح کر لیا جبکہ نہ کوئی خونریزی ہوئی نہ کوئی دشواری پیش آئی اور نہ کسی کو ذرا سا بھی گزند پہنچا۔ شاید پیغمبر اکرم جو یہ چاہتے تھے کہ مکہ بغیر خونریزی کے فتح ہو جائے ان کی نگاہ مبارک میں حرمت کعبہ کے علاوہ یہ مسئلہ بھی در پیش تھا۔ اگر کہیں اور جنگ ہوئی ہوتی، اور سو مسلمان بھی قتل ہو جاتے تو کوئی محسوس کرنے والی بات نہ ہوتی۔ لیکن اگر فتح مکہ کے دوران مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچتا تو یہی کہا جاتا کہ دیکھو! (معاذ اللہ) جو کچھ اصحاب فیل کے ساتھ پیش آیا وہی اصحاب محمدؐ کے ساتھ بھی ہوا۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ کو اس طرح فتح کیا کہ ایک قطرہ خون نہیں بہا، نہ مسلمانوں کا اور نہ کفار کا، صرف خالد بن ولید نے اپنے ذاتی کینہ کی بنا پر مکہ کے ایک گوشہ میں مقابلہ کرنے والوں میں سے دو تین افراد کو قتل کر دیا لیکن جب اس کی خبر پیغمبرؐ کو معلوم ہوئی تو آپ بری طرح ناراض ہوئے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟! ساتھ ہی آپ نے اس کے اس عمل سے بیزاری و برائت کا اظہار بھی کیا: خدایا جو عمل اس شخص نے انجام دیا ہے میں اس سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں میں اس عمل پر ہرگز راضی نہیں تھا۔

یہی وجہ تھی کہ فتح مکہ نے اہل عرب پر غیر معمولی نفسیاتی اثر ڈالا اور وہ کہنے لگے کہ لگتا ہے

حقیقت کچھ اور ہی ہے، محمدؐ آئے انہوں نے مکہ کو اتنی آسانی سے فتح بھی کر لیا اور ان کو کوئی گزند بھی نہ پہنچا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد اہلِ عرب خود بخود تسلیم ہونے لگے۔ گروہ کے گروہ آتے تھے اور اسلام اختیار کرتے تھے۔ قرآن فرماتا ہے: لایستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃً من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا۔[1] جن لوگوں نے فتح مکہ کے پہلے خدا کی راہ میں جانی و مالی فداکاری کی ہے اور جنھوں نے فتح مکہ کے بعد یہ عمل انجام دیا دونوں برابر نہیں ہیں۔ کیونکہ فتح مکہ سے قبل مسلمان اقلیت میں تھے (اور ان کی فداکاریاں) ان کے کامل ایمان کی بنیاد پر تھیں۔ لیکن فتح مکہ کے بعد لوگ خود بخود آ کر اسلام قبول کرنے لگے لہٰذا فتح مکہ کے بعد والے ایمان سے قیمتی فتح مکہ کے پہلے والا ایمان ہے۔ لہٰذا فتح مکہ کا روز اسلام کی تاریخ کا بہت عظیم روز ہے اس میں کسی کو کلام نہیں ہے، اور ہم بھی اسے قبول کرتے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ روز جس کو قرآن میں اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا شاید وہ فتح مکہ کا روز ہو۔ (اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس دعوےٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے نہ لفظی قرینہ کی حیثیت سے اور نہ تاریخ کی حیثیت سے)

یہاں "الیوم" سے مراد فتح مکہ کا روز ہے اس سے متعلق کسی قرینہ یا تاریخی ثبوت کے فقدان کے علاوہ خود صدر آیت اس مفہوم کی تائید نہیں کرتی۔ کیونکہ ارشاد ہے: اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی" دین مکمل کر دیا اور اپنی ساری نعمتیں تمام کر دیں یعنی اب اسلام سے متعلق کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی سب کچھ بیان کیا جا چکا ہے۔ جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام کے بہت سے احکام فتح مکہ کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ یہ بات" اتممت علیکم نعمتی "سے میل نہیں کھاتی جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے یہ مکان مکمل کر دیا تو بہرحال اس سے مراد ادھورا مکان نہیں ہے۔ بہت سی آیتیں منجملہ ان کے پورا سورۂ مائدہ جو اتفاق سے کافی مفصل اور طویل ہے اور اس میں خاصے

---

[1] سورۂ حدید، آیت ۱۰

احکام بیان کئے گئے ہیں، فتح مکہ کے بعد نازل ہوا ہے ۔ اور یہ آیت جو خود سورۂ مائدہ کا جزو ہے فتح مکہ سے متعلق کیسے ہو سکتی ہے ۔ جبکہ مکہ آٹھویں ہجری میں فتح ہوا اور سورۂ مائدہ ۱۰ھ کے اواخر میں نازل ہوا ہے ۔ اگر کہا جائے کہ صرف یہ آیت فتح مکہ کے روز نازل ہوئی ۔ پھر بھی بات اتمام نعمت سے میل نہیں کھاتی اس آیت میں "الیوم" کے "روز فتح مکہ" قرار دیئے جانے پر ایک اعتراض اور بھی ہے ۔ وہ یہ کہ آیت کہہ رہی ہے : الیوم یئس الذین کفروا من دینکم " آج کافرین تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ۔ یعنی اب وہ تمہارے دین پر تسلط حاصل کرنے سے مایوس ہو گئے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا فتح مکہ کے روز ایسا ہی ہوا؟ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی اس کامیابی نے کفار پر بہت گہرا اثر ڈالا لیکن حقیقتاً کیا وہ ایسا ہی روز تھا کہ کفار اس دین کے نابود کرنے کے سلسلہ میں بالکل مایوس ہو گئے ؟ ہرگز نہیں ۔

۳ ۔ امیر المومنینؑ کے ذریعہ منیٰ میں سورۂ برائت کی تبلیغ کا دن : یہ دن بھی تاریخ اسلام کا بہت اہم دن مانا جاتا ہے اور مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے یہاں "الیوم" سے مراد منیٰ میں امیر المومنینؑ کے ذریعہ سورۂ برائت کی قرائت و تبلیغ کا دن ہے ۔ یہ واقعہ ہجرت کے نویں سال ظہور میں آیا ۔ فتح مکہ ایک فوجی و نظامی فتح تھی، حتی اس فتح سے اسلام کی معنوی قوت بھی خاصی محکم ہو گئی تھی ۔ لیکن ابھی پیغمبرؐ کفار کے ساتھ صلح کے طے شدہ معاہدہ کی شرطوں کے تحت زندگی گزار رہے تھے ۔ اس بنا پر وہ بھی خانۂ کعبہ کے طواف اور مکہ میں زندگی کا حق رکھتے تھے ساتھ ہی انھیں حج کے مراسم میں شرکت کا حق حاصل تھا اور ایک سال حج کی یہی صورت حال تھی ۔ مسلمان اور کفار دونوں حج میں شریک ہوئے ۔ مسلمانوں نے اسلامی دستور کے مطابق حج ادا کیا اور کفار اپنے طور پر حج کے مراسم انجام دیتے رہے ۔ ہجرت کے نویں سال سورۂ برائت نازل ہوا ۔ اور طے ہوا کہ امیر المومنینؑ منیٰ میں عام مجمع کے سامنے اس سورہ کی قرائت کریں کہ اب مشرکین کو حج میں شرکت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اور یہ عبادت صرف مسلمانوں سے مخصوص ہے اور بس ۔

یہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے پہلے ابوبکر کو امیر الحاج بنا کر مکہ کی جانب روانہ کیا ۔ لیکن وہ ابھی راستہ میں تھے کہ آیت نازل ہوئی ۔" اب یہ کہ ابوبکر سورۂ برائت بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے یا اس وقت تک سرے سے سورۂ برائت نازل ہی نہیں ہوا تھا اور وہ صرف امیر الحاج بنا کر بھیجے گئے تھے ؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔ لیکن بہرحال شیعہ و سنی سب کا اس پر اتفاق

ہے اور اسے فضائل علیؑ کا جزو شمار کرتے ہیں، کہ پیغمبر اکرمؐ نے امیر المومنین کو اپنے مخصوص مرکب کے ذریعہ روانہ کیا اور ان سے فرمایا کہ جاؤ مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے کہ اس سورہ کو لوگوں کے درمیان یا میں خود پڑھوں یا وہ جو مجھ سے ہو۔ امیر المومنینؑ گئے اور راستہ میں ابوبکر سے ملاقات کی۔ واقعہ یوں نقل کیا جاتا ہے کہ ابوبکر خیمہ میں بیٹھے تھے کہ پیغمبرؐ کے مخصوص شتر نے آواز بلند کی، آپ اس آواز کو پہچانتے تھے، کہنے لگے یہ پیغمبرؐ کے اونٹ کی آواز ہے۔ یہ یہاں کیسے آیا؟ ناگاہ انہوں نے دیکھا کہ علیؑ تشریف لائے ہیں۔ بہت رنجیدہ ہوئے۔ سمجھ گئے کہ کوئی اہم خبر ہے۔ دریافت کیا، کیا کوئی بات ہو گئی ہے؟ آپ نے فرمایا پیغمبرؐ نے مجھے حکم دیا ہے کہ سورۂ برائت لوگوں کے درمیان میں جا کر پڑھو۔ پوچھا، میرے خلاف تو کچھ نہیں نازل ہوا ہے؟ فرمایا نہیں۔ یہاں پر اختلاف ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں علیؑ گئے اور انہوں نے سورۂ برائت کی تلاوت فرمائی۔ ابوبکر نے بھی اپنا سفر جاری رکھا پس یہ منصب و ذمہ داری آپ کے ہاتھ میں نہ رہی لیکن شیعہ اور بہت سے اہل سنت کا عقیدہ، جیسا کہ تفسیر المیزان میں بھی نقل ہوا ہے یہ ہے کہ ابوبکر وہاں سے واپس پلٹ آئے اور پیغمبرؐ کی خدمت میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا اس سورہ میں میرے خلاف کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟ فرمایا، نہیں۔

سورۂ برائت کے اعلان کا دن بھی مسلمانوں کے لئے بڑا عظیم دن تھا۔ اس روز یہ اعلان ہوا کہ آج سے کفار و مشرکین حج کے مراسم میں شریک نہیں ہو سکتے، حرم کی سرزمین صرف مسلمانوں سے مخصوص ہے۔ مشرکین سمجھ گئے کہ اب شرک کی حالت میں زندگی نہیں گزار سکتے۔ اسلام شرک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ لسے یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت جیسے ادیان کے ساتھ تو معاشرتی زندگی قبول ہے لیکن شرک کے ساتھ زندگی کسی صورت برداشت نہیں۔ چنانچہ اس روز کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا گیا کہ شاید یہاں "الیوم" سے مراد یہی روز ہو۔

اس کا جواب یوں دیا گیا کہ یہ بات: "اتممت علیکم نعمتی" میں نے اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دیں اور دین کی عمارت اتمام کو پہنچ گئی، کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھاتی، کیونکہ بہت سے احکام اس روز کے بعد بھی نازل ہوئے ہیں۔ یہ روز بہرحال پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں سے ہونا چاہئے کہ جس کے بعد کوئی حکم یا قانون نازل نہ ہوا ہو۔

جو افراد "الیوم" سے فلاں روز مراد لیتے ہیں ان کے پاس اپنی بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

یعنی نہ صرف تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی، بلکہ قرآن سے بھی ان کی بات ثابت نہیں ہوتی۔

شیعوں کا بیان

یہاں شیعہ ایک بات کہتے ہیں اور اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ آیات کے مضمون سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور تاریخ سے بھی۔ لہٰذا اس پر دو نوعیت سے بحث ہونی چاہئے۔ ایک یہ کہ آیات کا مضمون اس کی تائید کرتا ہے۔ اور دوسرے تاریخ بھی اس کی مؤید ہے۔

۱۔ تاریخ کے آئینہ میں: یہ تاریخ کا بڑا ہی تفصیلی مسئلہ ہے۔ زیادہ تر کتابیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں ان میں اکثر و بیشتر اس پر انحصار کیا گیا ہے کہ تاریخ و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کریں کہ آیت: "الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً" غدیر خم میں نازل ہوئی ہے۔ کتاب "الغدیر" نے اسی بات کو ثابت کیا ہے۔ حدیث کی کتابوں کے علاوہ، مؤرخین کا نقطۂ نگاہ بھی یہی ہے۔ اسلام کی قدیم ترین، عمومی اور معتبر ترین تاریخ کی کتاب "تاریخ یعقوبی" ہے جسے شیعہ و سنی دونوں معتبر جانتے ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر آیتی نے کتاب کی دونوں جلدوں کا (فارسی میں) ترجمہ کیا ہے۔ کتاب بہت ہی متقن و محکم ہے۔ اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں غالباً عہد مامون کے بعد متوکل کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب جو فقط تاریخ کی کتاب ہے اور حدیث سے اس کا تعلق نہیں ہے، ان بہت سی کتابوں میں سے ایک ہے جس میں غدیر خم کا واقعہ لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اہل سنت کی لکھی ہوئی دوسری کتابیں بھی ہیں جنھوں نے غدیر کے واقعہ کو لکھا ہے۔

روایت یوں ہے کہ پیغمبر اسلام حجۃ الوداع[1] سے واپس ہوتے ہوئے جب غدیر خم پہنچے،

---

[1] حجۃ الوداع، پیغمبرؐ کی آخر عمر میں آپ کی وفات کے دو ماہ پہلے کا حج تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات ۲۸ صفر یا اہل سنت کے مطابق ۱۲ ربیع الاول کو واقع ہوئی۔ حضرتؐ ۱۸ ذی الحجہ کو غدیر خم پہنچے۔ غدیر کا واقعہ شیعوں کے مطابق دفات پیغمبر اسلامؐ سے دو ماہ دس روز قبل اور اہل سنت کے مطابق دو ماہ چوبیس روز پہلے پیش آیا ہے۔

"جوجحفہ" کے نزدیک ہے تو آپ نے قافلہ روک دیا اور اعلان فرمایا کہ: میں لوگوں سے ایک اہم بات کہنا چاہتا ہوں۔ (یہ آیتیں بھی وہیں نازل ہوئیں)، اس کے بعد آپؐ کے حکم سے اونٹوں کے کجاؤں اور دوسری چیزوں کے ذریعہ ایک اونچا منبر بنایا گیا۔ حضرتؐ بالائے منبر تشریف لے گئے اور ایک مفصل خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپؐ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے دریافت فرمایا: الست اولیٰ بکم من انفسکم؟ قالوا بلیٰ۔ تب آپؐ نے فرمایا: "من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ" اسی کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

اگر ہم اس کے تاریخی پہلو پر بحث کرنا چاہیں تو شیعہ و سنی اور خاص طور سے اہل سنت کی ایک ایک کتاب کا تحقیقی جائزہ لینا ہوگا جنھوں نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ان چیزوں کا کتاب "الغدیر" یا اس کے جیسی دوسری کتابوں میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ابھی چند سال پہلے کانون نشر حقائق "مشہد سے غدیر کے موضوع پر ایک مختصر اور جامع کتاب شائع ہوئی ہے جس کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں ہے۔

شیعہ، تاریخی حیثیت سے ایک استدلال یہ کرتے ہیں کہ جب آیت: الیوم اکملت لکم دینکم" سے لفظی طور پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ "الیوم" سے مراد کون سا روز ہے تو اس آیت کی تاریخ وشان نزول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نتیجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک، دو یا دس نہیں بلکہ متواتر طور پر روایات یہ بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت غدیر کے روز نازل ہوئی ہے جب پیغمبر اکرمؐ نے علیؑ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔

لہ شاید آپ میں سے بعض حضرات جحفہ گئے ہوں۔ مجھے اپنے دوسرے سفر حج میں جحفہ جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ کیونکہ میرے مدینہ کے سفر میں تاخیر ہوئی اور میں حج کے بعد گیا۔ یہاں ہے ہم جدہ گئے۔ اس جگہ فتووں میں اختلاف ہے کہ جدہ سے احرام باندھا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ اختلاف بھی حقیقتاً فتوائی اختلاف نہیں ہے بلکہ جغرافیائی ہے کیونکہ وہ جگہ جو کسی ایک میقات کے مقابل ہو وہاں سے احرام باندھا جاسکتا ہے۔ ایک جغرافیہ داں جو عرب کے جغرافیہ سے بخوبی واقف ہو شاید جدہ کے کسی ایک میقات کے مقابل ہونے یا نہ ہونے کی دقیقی طور سے تعیین کرسکتا ہے۔ ہم نے خود بھی پہلے عمل نہیں کیا، لیکن بعد میں مکہ اور مدینہ میں عرب کا ←

۲۔ آیت میں موجود قرائن کی روشنی میں ، لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا آیت میں موجودہ قرائن بھی ان نکات کی تائید کرتے ہیں جن کی مؤید تاریخ ہے ؟ آیت یہ ہے : الیوم یئس الذین کفروا من دینکم " آج یا (اس روز) کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے "۔ اسے ہم قرآن کی ان آیات کا ضمیمہ قرار دیتے ہیں جن میں مسلمانوں کو خبردار کیا اور ڈرایا گیا ہے کہ دیکھو کفار برابر تمہارے دین کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، تم کو تمہارے دین سے منحرف کر دینا چاہتے ہیں اور تمہارے دین کے خلاف اقدامات میں معروف ہیں۔ اس کوشش میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں شامل ہیں : ودّ کثیر من اھل الکتاب لو یردّونکم من بعد ایمانکم کفاراً حسداً من عند انفسھم[۱] " (یعنی بہت سے اہل کتاب تمہارے ایمان پر حسد کرتے ہوئے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ تمہیں دوبارہ (ایمان سے) کفر کی دنیا میں کھینچ لے جائیں) چنانچہ ایک طرف خدا قرآنی آیات کے ذریعہ ظاہر کر رہا ہے کہ کفار تمہارا دین مٹانے کے درپے ہیں اور دوسری طرف اس آیت میں فرماتا ہے ۔" لیکن اب آج سے کفار مایوس ہو گئے " آج سے وہ تمہارے دین کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے ۔ فلا تخشوھم اب ان کی طرف سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے " واخشون " مجھ سے ڈرو ۔ یعنی آج کے بعد سے تمہارا دین مٹتا رہے ، ضعیف ہو جائے یا جو کچھ بھی تمہیں پیش آئے ، بس مجھ سے ڈرتے رہو ۔ یہ " مجھ سے ڈرو " کے معنی کیا ہیں ؟ کیا خدا خود اپنے دین کا دشمن ہے ؟ نہیں ۔ اس مختصر سے جملہ کا مفہوم وہی ہے جس کا قرآن کی بہت سی آیتوں میں خدا کی طرف سے اپنے بندوں کو نعمتوں سے محروم کر دینے

← نقشہ دیکھنے کے بعد یہ نظر آیا کہ جدہ بھی بعض میقاتوں کے روبرو آتا ہے ۔ خیر ۔ یہ ہے کہ وہ نقشہ درست رہا ہو ۔ جو لوگ جدہ سے مکہ جانا چاہتے ہیں اور احتیاط کی بنا پر کسی ایک واقعی میقات سے احرام باندھنا چاہتے ہیں وہ جدہ سے جحفہ آتے ہیں ۔ جحفہ مدینہ کی شاہراہ کے نزدیک ہے ۔ یہ اہل شام کا میقات ہے ۔ شام مکہ کے شمال مغرب میں واقع ہے ۔ چنانچہ جب لوگ شام سے مکہ کی طرف آتے تھے تو کچھ مسافت طے کرنے کے بعد جحفہ پہنچتے تھے ۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس طرف سے آنے والوں کے لئے اسے میقات قرار دیا ۔ غدیر خم جحفہ کے نزدیک واقع ہے اور ایسی جگہ ہے کہ جب مسلمان مکہ سے واپس ہوتے ہوئے اس جگہ پر پہنچتے تھے تو وہیں سے الگ الگ سمتوں میں متفرق ہو جاتے تھے ۔ اہل مدینہ ، مدینہ کی جانب اور دوسرے شہروں والے اپنی اپنی منزلوں کی طرف ۔

[۱] سورہ بقرہ ، آیت ۱۰۹

کے سلسلہ میں ایک بنیادی اصول کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم"[1] یا "ذٰلک بان اللہ لم یک مغیراً نعمۃ انعمھا علیٰ قوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم"[2]، ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم جو نعمت بھی کسی قوم پر نازل کرتا ہے اس سے وہ نعمت اس وقت تک سلب نہیں کرتا جب تک لوگ خود کو اس کے لئے نااہل قرار نہیں دیتے یعنی جب لوگ خود اپنے ہاتھوں سے اس نعمت کو زائل کردینا چاہیں اور اس کی بے قدری کرنے لگیں تو خدا بھی اس سے وہ نعمت دور کردیتا ہے۔ یہ "قانون" دراصل قرآن کا ایک بنیادی و اساسی قانون ہے۔

محکمات و متشابہات

زیر بحث آیت کو دیکھتے ہوئے ایک بات جو بہت سے موارد میں پیش آتی ہے عرض کردینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں کی تفسیر کرتی ہیں: "القرآن یفسر بعضہ بعضاً"، قرآن ایک کھلی ہوئی اور روشن کتاب ہے۔ خود بھی روشن و واضح ہے اور ظاہر و آشکار کرنے والی بھی، خود قرآن کہتا ہے کہ مجھ میں دو طرح کی آیتیں موجود ہیں، محکمات اور متشابہات۔ آیات محکمات کو قرآن "ام الکتاب" کا نام دیتا ہے۔ جو ایک عجیب تعبیر ہے: ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابہات "متشابہ" آیت ایسی آیت ہے جس کے مفہوم کو کئی اعتبار سے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ آیت محکمہ سے صرف فقط ایک ہی مفہوم اور معنی نکلتا ہے۔ قرآن جو آیات محکمات کو "ام" یا ماں کے نام سے یاد کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ متشابہ آیات کو محکم آیات کی مدد سے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ اگر قرآن کی کوئی آیت ایسی ہو جس کے چند معنی نکلتے ہوں تو ہمیں خود اس کے معنی بیان کرنے اور شرح کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت کو سمجھنے کے لئے قرآن کی طرف

---

[1] سورۂ رعد، آیت/ ۱۱

[2] سورۂ انفال، آیت/ ۵۳

رجوع کرنا ہوگا اور اس کی تمام آیات کی روشنی میں ہی اس آیت کا مفہوم سمجھا جا سکے گا۔ متشابہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مجمل ہے یا اس میں جو لفظیں استعمال کی گئی ہیں اس کے معنی ہم نہیں جانتے بلکہ ایسی آیت کا مطلب یہی ہے کہ اس کے ایک دوسرے سے قریب اور متشابہ کئی معنی بیان کئے جا سکتے ہیں۔

مثلاً قرآن کریم میں پروردگار عالم کی مشیت مطلقہ سے متعلق آیتیں ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تحت ہیں۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ منجملہ ان میں سے یہ آیت ہے جو اسی بناپر متشابہ ہے: قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء تذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کل شئی قدیر"

(اب اس سے زیادہ محکم وبالاتر تاکید نہیں ہو سکتی) یعنی کہو کہ اے میرے خدا! تمام ملکوں اور تمام قوتوں کا اصل مالک تو ہے۔ جسے چاہتا ہے تو ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چھیننا چاہتا ہے تو چھینتا ہے جسے عزت دیتا ہے تو بخشتا ہے اور جسے ذلیل کرتا ہے تو ذلیل کرتا ہے۔ خیر و بھلائی صرف اور صرف تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہر شئے پر قادر ہے " یہ آیت اس اعتبار سے متشابہ ہے کہ اس کے کئی طرح سے معنی کئے جا سکتے ہیں۔ اجمالاً یہ آیت اتنا ہی کہتی ہے کہ ہر شئے مشیت الٰہی میں ہے اور یہ بات دو طرح سے ممکن ہے، ایک یہ کہ مشیت الٰہی میں کوئی چیز کسی شئے کے لئے شرط نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے اسی طور پر غلط نتیجہ اخذ کیا ہے اور کہا ہے کہ ممکن ہے وہ تمام حالات و شرائط جنھیں ہم عزت کے شرائط کے نام سے یاد کرتے ہیں، فراہم ہو جائیں، پھر بھی عزت کے بجائے ذلت ہاتھ آئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذلت کے تمام حالات و شرائط پیدا ہوں لیکن اس کا نتیجہ عزت کی صورت میں سامنے آئے! دنیا و آخرت کی سعادت و نیک بختی میں کوئی شئے کسی چیز کے لئے شرط نہیں ہے کیونکہ تمام چیز مشیت الٰہی سے وابستہ ہے! نتیجہ یہ نکلا کہ ممکن ہے کوئی قوم یا کوئی شخص بلا کسی سبب یا بغیر کسی مقدمہ کے دنیا میں عزت و شرف کے کمال پر پہنچ جائے یا بلا کسی سبب کے ایکدم ذلیل و رسوا ہو جائے۔ یوں ہی ممکن ہے آخرت میں کسی قوم کو بلا کسی قید و شرط کے اعلیٰ علیین کا مرتبہ عطا کر دیا جائے اور کسی قوم کو بلا سبب اور بغیر کچھ دیکھے بھالے جہنم کے درک اسفل میں ڈال دیا جائے۔ افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے جنھیں اشاعرہ کہتے ہیں اس آیت سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے، اور کہتے ہیں کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اگر (معاذ اللہ) پیغمبر اسلام جہنم میں چلے جائیں اور ابوجہل جنت میں بھیج دیا جائے کیونکہ خدا نے کہا

---

۱ سورۂ آل عمران، آیت/۲۶

ہے کہ سب کچھ خدا کی مشیت کے تحت ہے۔

لیکن یہ آیت سے مفہوم و مطلب نکالنے کا ایک غلط انداز ہے۔ آیت صرف اتنا کہہ رہی ہے کہ سب کچھ مشیت الٰہی میں ہے۔ یہ نہیں بیان کرتی کہ مشیت کس طرح کارفرما ہوتی ہے، اور نہ یہ بیان کرتی ہے کہ سعادت و شقاوت اور عزت و ذلت وغیرہ کے سلسلہ میں مشیت الٰہی کیا عمل کرتی ہے۔ لہٰذا اس آیت سے کئی معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم قرآن کی دوسری آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ محکم یا "ام الکتاب" کی حیثیت سے اس آیت کی تفسیر کرتی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ آیت بالکل صاف لفظوں میں کہتی ہے: "ذالک بان اللہ لم یک مغیرآ نعمۃ انعمہا علیٰ قوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم"[1] یا یہ آیت جو ایک حیثیت سے عمومیت رکھتی ہے: ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم[2] ان دونوں آیتوں میں سے ہر ایک جو بات رکھتی ہے، وہ دوسری میں نہیں پائی جاتی۔ دوسری آیت یہ کہتی ہے: کہ خداوند عالم اس وقت تک کسی قوم سے اس کی کوئی چیز نہیں لیتا جب تک وہ خود سے اس چیز کو سلب نہ کرلیں جو ان کے درمیان موجود ہے۔ یہ آیت عمومیت رکھتی ہے یعنی خداوند عالم کسی بھی قوم سے اس کی کوئی نعمت سلب نہیں کرتا اور انھیں بدبختی میں مبتلا نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو بدل نہ دیں۔ اسی طرح بدبخت قوم سے اس کی بدبختی دور نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے حالات نہ بدلیں جبکہ پہلی آیت میں فقط نعمتوں کا تذکرہ ہے بدبختی کا کوئی ذکر نہیں ہے، ہاں اس میں ایک نکتہ کا اضافہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: "ذالک بان اللہ لم یک مغیرا" یہ اس سبب سے کہ خدا ایسا نہیں ہے یا نہیں رہا ہے، جیسا کہ وہ قرآن میں فرماتا ہے: ماکان اللہ، خدا ایسا نہیں رہا ہے۔ یعنی اس کی الوہیت اسے قبول نہیں کرتی کہ وہ کسی قوم سے بلا سبب کوئی نعمت سلب کرلے۔ مشیت پروردگار بلاوجہ اور عبث کارفرما ہو اور کسی شئے کو کسی چیز کے لئے شرط قرار نہ دے یہ وہ فکر ہے جو ذات خدا کی حکمت و کمال اور اس کی الوہیت کے سراسر خلاف ہے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں آیتیں اس آیت کے لئے مادر قرار پائیں جنھوں نے اس کی تفسیر کردی۔ مشیت سے متعلق آیتیں بس اتنا بتاتی ہیں کہ تمام چیزیں خدا کے اختیار میں ہیں۔ اور یہ دونوں آیتیں بتاتی ہیں کہ مشیت خدا دنیا میں اس طرح اور اس قانون کے تحت کارفرما ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مطلب قرآن کا بہت ہی مناسب بنیادی اور اصلی مطلب ہے اور بہت سی آیتوں میں اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ اگر ہماری نعمت کا شکر بجالاؤ گے یعنی اس سے صحیح فائدہ

[1] سورۂ انفال/ ۵۳ [2] سورۂ رعد/ ۱۱

حاصل کرو گے تو ہم اسے تمہارے لئے باقی رکھیں گے۔ اور اگر ہماری نعمت سے کھیلو گے اور کفران نعمت کرو گے تو ہم اسے تم سلب کرلیں گے۔

اس اعتبار سے "الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون" کا مطلب یہ ہے کہ اب کفار، اسلامی معاشرہ سے باہر (تمہارے دین کو فنا کرنے سے) مایوس ہو گئے۔ اب دنیائے اسلام کو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اب مجھ سے ڈرو یعنی اے مسلمانو! اب خود اپنے آپ سے ڈرو۔ اب آج کے بعد سے اگر کوئی خطرہ ہوگا تو یہ ہوگا کہ تم لوگ نعمت اسلام کے سلسلہ میں بدعمل ہو جاؤ اور کفران نعمت کرنے لگو، اس دین سے جو فائدہ اٹھانا چاہئے نہ اٹھاؤ نتیجہ میں ہمارا یہ قانون تمہارے سلسلہ میں بھی جاری ہو: ان اللّٰہ لا یغیّر ما بقوم حتّیٰ یغیّروا ما بانفسھم" آج کے دن سے اسلامی معاشرہ کو کوئی باہری خطرہ نہیں رہ گیا۔ اب جو بھی خطرہ ہے، داخلی خطرہ ہے۔

سوال و جواب

سوال: جیساکہ آپ نے فرمایا، ہمارا عقیدہ ہے کہ امام دین و دنیا دونوں کا پیشوا ہوتا ہے۔ اور یہ منصب مذکورہ دلائل سے حضرت امیرالمومنین علیؑ کی ذات سے مخصوص ہے۔ پھر قتل عثمان کے بعد جب لوگ آپ کی بیعت کرنے آئے تو آپ نے تامل کیوں فرمایا؟ یہ کوئی تامل کی جگہ نہیں تھی۔ اسے تو آپ کو خودبخود قبول کرنا چاہئے تھا۔

جواب: جناب کا یہ سوال "خلافت و ولایت" نام کی کتاب میں بھی جو کچھ عرصہ پہلے شایع ہوئی ہے اٹھایا گیا ہے۔ اس کا جواب خود حضرت علیؑ کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ جب لوگ آپ کے پاس بیعت کے لئے آئے تو آپ نے فرمایا: دعونی والتمسوا غیری فانا مستقبلون امراً لہ وجوہ والوان[1]" مجھے چھوڑ دو کسی اور کے پاس جاؤ کیونکہ بڑے ہی سیاہ و تاریک حوادث ہمیں درپیش ہیں (عجیب و غریب تعبیر فرمائی ہے) مجھے ایسا امر درپیش ہے جس کے کئی چہرے ہیں یعنی ایک صورت سے اسے حل نہیں کیا

[1] نہج البلاغہ، فیض الاسلام خطبہ ۹۱

جا سکتا بلکہ اس کے لئے مختلف صورتیں اختیار کرنی ہوں گی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: "ان الآفاق قد اغامت والمحجۃ قد تنکرت" مختصر یہ کہ پیغمبر اکرمؐ جو روشن و واضح راہ معین فرما گئے تھے وہ راہ اب انجانی ہو گئی ہے۔ فضا ابر آلود ہو چکی ہے"۔ اور آخر میں فرماتے ہیں اگر میں تم پر حکومت کروں گا تو: "رکبت بکم ما اعلم" اس روش پر حکومت کروں گا جو میں جانتا ہوں تمہاری دلخواہ حکومت نہیں کروں گا۔

اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے یہ بات جو تاریخی حیثیت سے بھی پورے طور سے قطعی و مسلّم ہے، اچھی طرح درک کر لی تھی کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد کے عہد اور آج کے زمانہ میں زمین و آسمان کا فرق ہو چکا ہے یعنی حالات بڑی ہی عجیب و غریب حد تک تبدیل اور خراب ہو چکے ہیں، اور یہ جملہ امامؑ نے کامل طور پر اتمام حجت کے لئے فرمایا ہے، کیونکہ بیعت کا مطلب ان لوگوں سے پیروی کرنے کا عہد لینا ہے، بیعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تم لوگ بیعت نہیں کرو گے تو میری خلافت باطل ہو جائے گی۔ بلکہ بیعت یہ ہے کہ لوگ اس بات کا قول دیتے ہیں کہ آپ جو عمل انجام دیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

یہ بات تمام شیعہ اور اہل سنت مؤرخین نے لکھی ہے کہ عمر کے بعد شوریٰ کا جو قضیہ پیش آیا، اس شوریٰ کے چھ افراد میں سے ایک علیؑ بھی تھے۔ اس میں تین افراد دوسرے تین افراد کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ زبیر، علیؑ کے حق میں الگ ہو گئے، طلحہ، عثمان کے حق میں اور سعد وقاص، عبد الرحمٰن بن عوف کے حق میں علاحدہ ہو گئے۔ باقی بچے تین افراد ان تین افراد میں سے عبد الرحمان بن عوف نے خود کو میدان ہی سے الگ کر لیا۔ دو شخص باقی بچے علیؑ اور عثمان (اور اس ایثار کے عوض) انتخاب کی کلید عبد الرحمان بن عوف کے ہاتھ میں آ گئی کہ وہ جسے منتخب کریں وہی خلیفہ ہے۔ وہ پہلے امیر المومنینؑ کے پاس آئے اور کہا میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آمادہ ہوں لیکن ایک شرط ہے کہ آپ کتاب خدا، سنت رسولؐ اور سیرتِ شیخین کے مطابق عمل کریں گے۔ آپ نے فرمایا میں تیار ہوں لیکن صرف کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کروں گا۔ سیرت شیخین کی شرط سے انکار کر دیا۔ عبد الرحمٰن بن عوف نے عثمان کے سامنے بھی بیعت کے لئے یہی شرط رکھی۔ انہوں نے کتاب خدا، سنت رسولؐ اور سیرت شیخین پر عمل کی شرط قبول کر لیا۔ جبکہ بقول آقای محمد تقی شریعتی "عثمان نے سیرت شیخین پر عمل کا وعدہ تو کیا تھا لیکن اتفاق سے ان کی سیرت پر عمل ہی نہیں کیا"۔ اگر ہم یہاں مقابلہ و موازنہ کریں تو چونکہ سیرت امیر المومنینؑ اور سیرت پیغمبر اکرمؐ ایک ہی تھی اس لئے آپ کی سیرت شیخین کی سیرت سے بھی بہت کچھ ملتی جلتی تھی کیونکہ شیخین کافی حد تک پیغمبر اکرمؐ

کی سیرت پر عمل کرتے تھے۔ لیکن اگر امیر المومنینؑ اسی وقت اس شرط کو قبول کر لیتے تو گویا وہ انحرافات اور غلطیاں جو شیخین کے دور میں پیدا ہو چکی تھیں ان پر صاد فرما دیتے اور پھر ان غلطیوں کے خلاف اقدام یا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا آپ نے اس شرط کو قبول نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر تفاضل (وظائف کی تقسیم میں کمی و زیادتی) کا مسئلہ یعنی انصار و مہاجرین اور عرب و عجم وغیرہ کے درمیان امتیاز پیدا کر کے مساوات اسلامی کو ختم کرنے کی بنیاد عمر کے زمانہ میں ہی پڑی ہے جبکہ امیر المومنینؑ اس کے سخت مخالف تھے، چنانچہ اگر آپ فرما دیتے کہ میں سیرت شیخین کے مطابق عمل کروں گا تو جو کچھ عمر کے زمانہ میں ہو چکا تھا اسے باقی رکھنے پر مجبور ہوتے جبکہ آپ اس عمل پر اپنی مہر ثبت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ساتھ ہی جھوٹا وعدہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ آج کہہ دیں کہ ہاں میں عمل کروں گا اور کل اس سے مکر جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے صاف انکار کر دیا۔

بنابر ایں جب علیؑ، عمر کے بعد سیرت شیخین پر عمل کرنے کو آمادہ نہیں تھے جبکہ سیرت پیغمبرؐ سے ان کے انحرافات بہت کم تھے (تو ظاہر سی بات ہے کہ) عثمان کے بعد جب حالات ایک دم خراب ہو چکے تھے اور خود حضرتؑ کے بقول اسلام کا اندوہناک مستقبل کئی رخ سے سامنے آ رہا تھا۔ مزید یہ کہ مسلمان بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ جس طرح چاہتے ہیں علیؑ اس طرح حکومت کریں، ایسی صورت میں آپ نے صاف طور پر واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اگر میں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لوں گا تو جس طرح میں مناسب سمجھوں گا عمل کروں گا نہ یہ کہ جس طرح تم چاہتے ہو۔ چنانچہ آپ ان لفظوں میں حکومت سے انکار نہیں فرما رہے تھے بلکہ آپ مکمل طور سے اتمام حجت کر دینا چاہتے تھے۔

سوال: ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن میں اتحاد کے سلسلہ میں بہت تاکید کی گئی ہے لہٰذا مسئلہ امامت اور جانشینی امیر المومنین کی اہمیت کے پیش نظر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کا ذکر صاف لفظوں میں قرآن میں کیوں نہ کر دیا گیا اور خود پیغمبر اسلامؐ نے متعدد مواقع پر اس موضوع کو کیوں بیان نہیں فرمایا؟

جواب: یہ دو الگ الگ سوال ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن میں اس موضوع کا صراحت سے ذکر کیوں نہ ہوا۔ اور دوسرے یہ کہ پیغمبر اکرمؐ نے متعدد مواقع پر اس مسئلہ کو بیان فرمایا یا نہیں؟ اس طرح قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے یا نہیں؟ دوسرے سوال کے جواب میں ہم بھی کہتے ہیں کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے حتیٰ بہت سے اہل سنت بھی اسے قبول کرتے ہیں کہ

پیغمبر اکرمؐ نے یہ بات متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے۔ یہ بات صرف غدیر خم تک محدود نہیں رہی ہے اور یہ بات موضوع امامت سے متعلق کتابوں میں موجود ہے۔ جملہ: "انت منّی بمنزلة هارون من موسیٰ الّا انه لا نبی بعدی" آنحضرتؐ نے تبوک کے واقعہ کے دوران فرمایا۔ یا جملہ: "لاعطین الرایة غداً رجلاً کراراً یحب اللّٰه ورسوله و یحبه اللّٰه ورسوله" جو علیؑ کے مرتبہ و منزلت کو ثابت کرتا ہے حضورؐ نے جنگ خیبر میں ارشاد فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ بعثت کے شروع میں ہی آپؐ نے قریش سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: تم میں سے جو سب سے پہلے میری بیعت کرے گا وہ میرا وصی، وزیر (حتیٰ وصی و وزیر اور خلیفہ) ہوگا۔ (اور وہ شخص علیؑ ہی تھے)

یہی صورت حال قرآن مجید میں ہے۔ قرآن میں بھی اس مسئلہ کو ایک، دو نہیں بلکہ متعدد جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے۔ صرف سوال اتنا سا ہے اور اتفاق سے یہ سوال بھی کتاب "خلافت و ولایت" میں اٹھایا گیا ہے کہ قرآن میں سیدھے سیدھے نام کا ذکر کیوں نہیں کر دیا گیا؟ چونکہ ہم تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں اور ہمارے عقیدہ کے مطابق کوئی چیز قرآن میں کم یا زیادہ نہیں ہوئی ہے لہٰذا یہ طے ہے کہ کہیں بھی علیؑ کا نام صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ہوا ہے۔

یہاں اس مسئلہ کو دو رخ سے بیان کیا جاتا ہے۔ ایک تو اسی کتاب "خلافت و ولایت" میں جناب محمد تقی شریعتی نے اس کی بڑے اچھے انداز میں وضاحت کی ہے قرآن ایک مخصوص طرز و روش رکھتا ہے اور وہ یہ کہ موضوعات کو ہمیشہ ایک اصل کے طور پر بیان کرتا ہے انفرادی و شخصی صورت میں ذکر نہیں کرتا اور یہ بذات خود قرآن کا ایک امتیاز ہے۔ مثلاً: "الیوم اکملت لکم دینکم" کے مسئلہ میں، کفار اس دین سے اس وجہ سے مایوس ہو گئے کہ وہ برابر کہا کرتے تھے کہ جب تک پیغمبرؐ موجود ہیں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ان کے اٹھ جانے کے بعد کوئی مسئلہ نہیں رہے گا، سب کچھ تمام ہو جائے گا۔ مخالفین پیغمبرؐ کی گویا یہ آخری امید تھی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھ لیا کہ پیغمبرؐ نے اپنی امت کی بقا کی تدبیر بھی کر ڈالی کہ میرے بعد لوگوں کا فریضہ کیا ہے تو مایوس ہو گئے۔

دوسری بات جسے اہل سنت نے بھی لکھا ہے، یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں قرآن کی آیت میں لفظ: "واخشون" سے متعلق کافی فکرمند اور پریشان رہتے تھے۔ یعنی خود امت کے ہاتھوں امت کے مستقبل سے متعلق فکرمند تھے۔ یہاں میں جو حدیث نقل کر رہا ہوں اسے اہل سنت

نے بھی نقل کیا ہے۔ ابو مذیہبہ، عائشہ کے غلام کا بیان ہے کہ پیغمبرؐ کی زندگی کی آخری شبیں تھیں ایک رات نصف شب کے وقت میں نے دیکھا کہ پیغمبرؐ اپنے حجرہ سے تنہا باہر تشریف لائے۔ کوئی شخص بیدار نہ تھا۔ آپ بقیع کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے جب دیکھا کہ پیغمبرؐ تنہا تشریف لے جا رہے ہیں تو خیال ہوا کہ حضرتؐ کو تنہا نہ چھوڑوں۔ اس خیال سے حضرتؐ کے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگا کہ دور سے آنحضرت کا ہیولا نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ نے اہل بقیع کے لئے استغفار کیا۔ اس کے بعد کچھ جملے ارشاد فرمائے جس کا مضمون یہ ہے: "تم سب چلے گئے، کیا خوب گئے اور سعادت و نیکی سے ہمکنار ہوئے۔ اب فتنے سر اٹھا رہے ہیں" کقطع اللیل المظلم" یعنی اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اپنے بعد کے فتنوں کی پیشین گوئی فرما رہے تھے جن میں مسلم طور پر یہ مسئلہ بھی رہا ہے۔

رہی یہ بات کہ (قرآن نے صاف طور سے جانشین پیغمبرؐ کے نام کا ذکر کیوں نہ کر دیا) تو اس کے جواب میں پہلی بات یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن کا اصول یہ ہے کہ وہ مسائل کو ایک اصل کی شکل میں بیان کرتا ہے۔ دوسرے نہ پیغمبرؐ اسلام اور نہ خداوند عالم کا منشا یہ تھا کہ یہ مسئلہ جس میں آخر کار ہوا و ہوس کے دخل کا امکان ہے۔ اس صورت سے سامنے آئے اگرچہ (جو کچھ ذکر کیا گیا) اس میں بھی لوگوں نے اپنی طرف سے توجیہ و اجتہاد کر کے یہ کہنا شروع کر دیا کہ نہیں پیغمبر اکرمؐ کا مقصد اصل میں یہ تھا اور وہ تھا۔ یعنی اگر کوئی آیت بھی (اس مسئلہ میں نام کی صراحت کے ساتھ) ذکر ہوئی ہوتی تو اس کی بھی توجیہ اپنے مطلب کے مطابق کر دی جاتی۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے ارشاد میں پوری صراحت کے ساتھ "ھذا علی مولاہ" فرمایا، اب اس سے زیادہ صریح اور واضح بات کیا ہو سکتی ہے؟! لیکن بہر حال پیغمبر اکرمؐ کے صریحی ارشاد کو زمین پر دے مارنے اور قرآن کی ایک آیت سے نام کی صراحت کے باوجود پیغمبرؐ اسلام کے دنیا سے اٹھتے ہی انکار کر دینے اور اس کی غلط توجیہ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ چنانچہ میں اس جملہ کو کتاب (خلافت و ولایت) کے مقدمہ میں نقل کر چکا ہوں کہ ایک یہودی نے حضرت امیر المومنینؑ کے زمانہ میں صدر اسلام کے ناخوش آئند حالات کے بارے میں مسلمانوں پر طنز کرنا چاہا (اور حقیقتاً یہ طنز کی بات بھی ہے) اس نے حضرتؑ سے کہا، مادفنتم نبیکم حتی اختلفتم فیہ" ابھی تم نے اپنے پیغمبرؐ کو دفن بھی نہیں کیا تھا کہ ان کے بارے میں

جھگڑنے لگے۔ امیرالمومنینؑ نے عجیب جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: انّما اختلفنا عنہ لا فیہ ولکنّکم ما جفّت ارجلکم من البحر حتّی قلتم لنبیّکم اجعل لنا الٰہًا کما لھم اٰلھۃ فقال انّکم قوم تجھلون[1] ہم نے پیغمبرؐ کے بارے میں اختلاف نہیں کیا بلکہ ہمارا اختلاف اس دستور و حکم کے سلسلہ میں تھا جو ان کے ذریعہ ہم تک پہنچا تھا، لیکن، ابھی تمہارے پاؤں دریا کے پانی سے خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ تم نے اپنے پیغمبر سے یہ تقاضہ کر دیا کہ وہ دین کی پہلی اور بنیادی اصل یعنی توحید کو ہی غارت کر دے، تم نے اپنے نبی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ دوسروں کے خداؤں کی طرح، ہمارے لئے بھی ایک بت بنا دے پس جو کچھ تمہارے یہاں گزرا اور جو ہمارے یہاں پیش آیا ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے خود پیغمبر کے بارے میں اختلاف نہیں کیا بلکہ ہمارا اختلاف یہ تھا کہ پیغمبرؐ کے اس دستور کا مفہوم اور مطلب کیا ہے۔ بڑا فرق ہے ان دونوں باتوں میں کہ جس کام کو انھیں بہر حال انجام دینا تھا۔ اس کی توجیہ ظاہر میں اس طرح ہو (نہ یہ کہ حقیقتاً ایسا ہی تھا) کہ یہ کہا جائے (جو لوگ اس خطا کے مرتکب ہوئے) ان کا خیال یہ تھا کہ اصل میں پیغمبر کا مقصود یہی تھا نتیجہ میں انہوں نے آنحضرتؐ کے قول کی اس شکل میں توجیہ کر ڈالی یا یہ کہا جائے کہ اتنی صریح اور واضح قرآن کی نص کو ان لوگوں نے ٹھکرا دیا یا قرآن کی تحریف کر ڈالی۔

سوال: فلاں ڈاکٹر صاحب نے جو سوال دریافت فرمایا ہے اسے میں اس صورت میں پیش کرتا ہوں کہ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں اصل اور بنیادی قانون ہی بیان ہونا چاہئے لیکن جانشینی کی اصل اور اسلام میں حکومت کا مسئلہ تو مسلم طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے چاہئے یہ تھا کہ قرآن میں نام کا ذکر ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دستور العمل کی حیثیت سے اس مسئلہ کو واضح طور سے بیان کر دیتا۔ مثلاً پیغمبرؐ کو یہ وحی ہو جاتی کہ تمہیں اپنا جانشین معین کرنا ہے۔ اور تمہارا نائب بھی اپنا جانشین خود معین کرے گا۔ اور یوں ہی یہ سلسلہ آخر تک قائم رہتا۔ یا دستور یہ ہوتا کہ جانشین کا انتخاب مشورہ (شوریٰ) سے ہوگا یا انتخاب سے ہوگا۔ یعنی

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۳۱۷

اسلام جیسے دین کے لئے جس میں حکومت و حاکمیت لازم و ضروری ہے جانشینی کا مسئلہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے جسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کی وضاحت نہ کی جائے۔ کوئی نہ کوئی جانشینی کا دستور تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حضرت علیؑ کے نام کا ذکر کیا جاتا یا نہ کیا جاتا۔ بلکہ جانشینی و حکومت کے طریقہ کار سے متعلق اس قدر اختلافات کو دیکھتے ہوئے ایک مستقل دستور العمل کی ضرورت بہرحال محسوس ہوتی ہے کہ لے پیغمبرؐ! تمہارا فرض ہے کہ اپنا جانشین مقرر کر دو۔ اب یہاں ممکن ہے یہ اختلاف ہوتا کہ کون جانشین ہے مختلف تفسیریں کی جاتیں۔ لیکن یہ بات تو قطعی اور یقینی ہوتی کہ اپنا جانشین پیغمبرؐ نے خود معین فرمایا تھا، اس کا مسلمانوں کی شوریٰ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح جانشین پیغمبر اپنے بعد اپنا جانشین یا امام مقرر کرتا۔ یا لوگوں کا گروہ اس کا انتخاب کرتا یا پھر لوگ اس سلسلہ میں مشورہ کرتے؟ بہرحال میری دانست میں یہ قضیہ قرآن کی روشنی میں بھی مبہم رہ گیا ہے۔ اور ہمارے پاس اس سلسلہ میں کوئی صریحی دستور العمل موجود نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ میں نے کچھ عرصہ پہلے "اسلام میں حکومت" کے موضوع پر ایک کتاب دیکھی جس میں خود حضرت علیؑ اور دیگر اشخاص کے بہت سے اقوال نقل ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امر (یعنی امر خلافت) عام مسلمانوں سے مربوط ہے اور مسلمانوں کو اس میں فیصلہ کا حق ہے۔ ارباب حل و عقد کو اپنی رائے دینا چاہئے۔ امر خلافت میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کو مشورہ کرنا چاہئے اور اپنی رائے پیش کرنی چاہئے، نیز مصنف نے ایسے بہت سے دلائل اکٹھا کئے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ اسلام میں حکومت کا مسئلہ ایک امر انتخابی ہے۔ نہ کہ تعیینی۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنا جانشین خود مقرر کرے۔ اس سلسلہ میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

تیسرے یہ کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ بارہ امام جانشین کے عنوان سے یکے بعد دیگرے معین ہوئے ہیں (اس سے بحث نہیں کہ وحی کے ذریعہ معین ہوئے یا کسی اور ذریعہ سے) یہ بتائیں کہ اسلامی معاشرہ میں ہمیشہ کے لئے کلی و قطعی طور پر جانشین کے تعین کا (نہ کہ انتخاب کا) کیا اصول یا قانون ہے۔ یعنی کیا پہلے سے یہ کہا جا چکا تھا کہ وحی الٰہی کے مطابق صرف یہ بارہ ائمہؑ جو ان خصوصیات کے حامل یعنی معصوم و ۔۔۔ ہیں یکے بعد دیگرے تعیین ہوں گے اور اس کے بعد زمانہ غیبت میں مثلاً یہ مسئلہ انتخاب کے ذریعہ حل ہوگا؟ کیا اس کی کہیں وضاحت کی گئی ہے؟ یہ استنباط تو

خود ہماری طرف سے ہے کہ چونکہ اس وقت بارھویں امام حاضر و موجود نہیں ہیں لہٰذا حکومت کا سربراہ مجتہد جامع الشرائط ہوگا یا نہ ہوگا۔ لیکن قرآن کو ایک بنیادی دستور العمل مسلمانوں کے حوالہ کرنا چاہئے کہ (پیغمبر اکرمؐ کے بعد شروع میں) ہم چند معصوم اشخاص کو خصوصی طور سے تم پر حاکم مقرر کریں گے۔ ان کے بعد تم خود اپنے باہمی مشوروں سے (کسی کا انتخاب کرو) یا فقیہ جامع الشرائط تم پر حاکم ہوگا۔ یہ مسئلہ بھی گیارھویں امام کے بعد سے الجھ جاتا ہے اور پھر مختلف اشکالات و اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں شیعی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟

جواب: ان سوالات کے جوابات ایک مدتک ہم گزشتہ جلسوں میں عرض کر چکے ہیں۔ آپ نے مسئلہ امامت کو دوبارہ اٹھایا ہے۔ وہ بھی صرف مسئلہ حکومت کی شکل میں۔ ہم گزشتہ ہفتوں میں عرض کر چکے ہیں کہ مسئلہ حکومت مسئلہ امامت سے الگ ہے۔ اور شیعی نقطۂ نظر سے امام کی موجودگی میں حکومت کا مسئلہ ویسا ہی ہے جیسا پیغمبر اکرمؐ کے عہد میں تھا۔ یہاں حکومت استثنائی حکم رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح پیغمبرؐ کے زمانہ میں یہ مسئلہ نہیں اٹھتا کہ پیغمبرؐ کے ہوتے ہوئے حکومت کس کی ہوگی یوں ہی امام (یعنی اس مرتبہ کا امام جس کے شیعہ قائل ہیں) کی موجودگی اور اس کے حضور میں بھی حکومت کا مسئلہ ایک فرعی اور طفیلی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اگر ہم مسئلہ حکومت کو بالکل الگ کر کے پیش کریں تو یہ ایک علاحدہ مسئلہ ہے۔ یعنی ایسے زمانہ میں جس میں امام کا وجود ہی نہ ہو (اور ایسا کوئی زمانہ ہے ہی نہیں) یا پھر امام غیبت میں ہو تو ایسی صورت میں البتہ یہ ایک بنیادی مسئلہ بھی ہے۔ اسی بنا پر ہم: "امرھم شوریٰ بینھم"، کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن یہ "امرھم شوریٰ بینھم" کہاں عمل میں آئے گا؟ کیا شوریٰ اس مسئلہ میں بھی کار فرما ہوگی جس میں قرآنی نص موجود ہے اور فرائض و وظائف روشن و واضح ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ شوریٰ ان مراحل کے لئے ہے جہاں نہ کوئی حکم الٰہی موجود ہو اور نہ کوئی دستور ہم تک پہنچا ہو۔

رہی "حکومت در اسلام" نامی کتاب میں تحریر مسائل کی بات، البتہ میں نے اس پر کامل تحقیق نہیں کی ہے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کتاب میں اول تو زیادہ تر مسائل یک طرفہ بیان ہوئے ہیں یعنی دلائل کے ایک رخ کو لکھا گیا ہے اور ان کے مخالف دلائل کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور یہ اس کتاب کا بہت بڑا عیب ہے کیونکہ انسان اگر کچھ لکھتا ہے تو اسے ہر پہلو کو مد نظر رکھنا چاہئے

اس کے بعد دیکھنا چاہئے کہ ان تمام دلائل میں کون سی دلیلیں وزنی اور معتبر ہیں ؟ کسے اپنانا چاہئے اور کسے چھوڑنا چاہئے ۔ ؟

اس کتاب کا دوسرا عیب یہ ہے کہ اس میں مطالب بیان کرنے کے سلسلہ میں قطع و برید سے کام لیا گیا ہے (اگرچہ میں نے خاص طور سے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے ، لیکن جن اہل نظر افراد نے اسے پڑھا ہے ۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ) اس نے جملوں کو ادھر آدھر سے کاٹ کر درمیان سے اپنے مطلب کی بات نقل کی ہے ۔ نتیجہ میں جملہ کا مفہوم ہی بدل گیا ہے ۔ اگر پوری بات نقل کی جاتی تو کبھی یہ معنی و مقصود ظاہر نہ ہوتے ۔ اس کے علاوہ ان دلائل کا بڑا حصہ ان مسائل سے مربوط ہے جو امام کی موجودگی اور ان کے حضور کے زمانہ سے تعلق نہیں رکھتے ، اور امام کی عدم موجودگی یا غیبت میں شوریٰ و انتخاب کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے ۔

اس سے قبل ہم نے آیت "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (۱) کے سلسلہ میں بحث کی تھی اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ خود آیت کے اندر موجود قرائن اور ان کے علاوہ اس سے متعلق دوسرے آثار وشواہد، یعنی آیت کی شان نزول کے تحت شیعہ وسنی ذرائع سے وارد ہونے والی روایات بھی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت واقعہ غدیر خم سے تعلق رکھتی ہے۔

چونکہ اس موضوع کے ذیل میں قرآن کی آیتیں ہماری بحث کا محور ہیں یعنی وہ آیتیں جن سے شیعہ اس باب میں استدلال کرتے ہیں لہٰذا ہم مزید دو تین آیتیں جنہیں علماء شیعہ استدلال میں پیش کرتے ہیں یہاں ذکر کر رہے ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ استدلال کا طریقہ کیا ہے؟

ان آیات میں سے ایک اسی "سورۂ مائدہ" کی آیت ہے جو مذکورہ بالا آیت سے تقریباً ساٹھ آیتوں کے بعد ذکر ہوئی ہے اور وہ یہ ہے: یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک

۱- سورہ مائدہ آیت نمبر ۳

پانچویں بحث

امامت قرآن کی روشنی میں

مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ/۶۷) اے پیغمبر جو کچھ آپ کے پروردگار کی جانب سے آپ پر نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو رسالت کی تبلیغ نہیں کی اور اپنا فریضہ ادا نہیں کیا۔ خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

گفتگو آگے بڑھانے سے پہلے مقدمہ کے طور پر کچھ باتیں ذکر کرنا ضروری ہیں تاکہ اس آیت کے مفاد کی وضاحت ہو جائے نیز یہ مقدمہ گذشتہ آیت کے تحت بیان کئے گئے مطالب کے لئے بھی معاون و مددگار ثابت ہو گا۔

اہل بیتؑ سے متعلق آیات کا خاص انداز

یہ بات واقعاً ایک اسرار کی حیثیت رکھتی ہے کہ مجموعی طور پر قرآن میں اہل بیتؑ سے متعلق آیتیں اور خصوصاً وہ آیتیں جو کم از کم ہم شیعوں کے نقطہ نظر سے امیر المومنینؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ایک خاص وضع و کیفیت کی حامل ہیں۔ اور وہ یہ کہ خود اس آیت کے اندر مطلب کی حکایت کرنے والی دلیلیں اور قرائن تو پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کوشش بھی نظر آتی ہے کہ اس بات کو دوسرے مطالب کے درمیان یا دوسری باتوں کے ضمن میں بیان کرتے ہوئے گزر جایا جائے۔ اس پہلو کو جناب محمد تقی شریعتی نے اپنی کتاب "ولایت و خلافت" کی ابتدائی بحثوں میں نسبتاً اچھے انداز سے بیان کیا ہے اگرچہ دوسروں نے بھی اس نکتہ کو بیان کیا ہے لیکن فارسی میں شاید پہلی بار انہوں نے ہی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ان لوگوں کا جواب بھی ہو جائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تھا کہ علی (ع)، پیغمبر (ص) کے جانشین ہوں، تو پھر قرآن میں صاف صاف ان کے نام کا ذکر کیوں نہیں ہے۔

آیت تطہیر

مثال کے طور پر آیت تطہیر کو لے لیں "اِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" (احزاب/۳۳) اس آیت کے بارے میں دریافت کیا

جائے تو ہم کہیں گے کہ اس کا مفہوم و مطلب بالکل واضح ہے۔ اللہ نے یہ ارادہ کیا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ (اہل بیت ع) تم سے کثافتوں کو دور کرے، تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے، وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا اور تمہیں مخصوص نوعیت اور خاص انداز میں تطہیر و پاکیزہ رکھے یا کرے۔ ظاہر ہے کہ جس تطہیر کا ذکر خدا کر رہا ہے وہ عرفی یا طبی تطہیر نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ خدا تم سے بیماریوں کو دور کرنا چاہتا ہے یا (معاذ اللہ) تمہارے بدن کے امراض کے جراثیم کو زائل کر رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہ تطہیر کا مصداق نہیں ہے، لیکن مسلّم طور پر جس تطہیر کو خدا اس آیت میں بیان فرما رہا ہے اس سے مراد پہلی منزل میں وہ تمام چیزیں ہیں جنہیں خود قرآن رجس کا نام دیتا ہے۔ قرآن کے بیان کردہ رجس و رجز وغیرہ یعنی وہ تمام چیزیں جن سے قرآن منع کرتا اور روکتا ہے اور جنہیں گناہ شمار کیا جاتا ہے چاہے وہ اعتقادی گناہ ہو، اخلاقی گناہ ہو یا عملی گناہ، یہ سب رجس و کثافت ہیں اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ اس آیت سے مراد عصمت اہل بیت ع ہے یعنی ان کا ہر طرح کی کثافت اور آلودگیوں سے پاک و پاکیزہ ہونا۔

فرض کیجئے کہ نہ ہم شیعہ ہیں نہ سنی، بلکہ ایک عیسائی مستشرق ہیں، عیسائی دنیا سے نکل کر آئے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی کتاب (قرآن) کیا کہنا چاہتی ہے ہماری نظر قرآن کے اس جملہ پر پڑتی ہے پھر ہم اس سے متعلق مسلمانوں کی تاریخ اور سنن و احادیث کا جائزہ لیتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف وہ فرقہ جسے شیعہ کہتے ہیں اور جو اہل بیت (ع) کا طرفدار ہے بلکہ وہ فرقے بھی جو اہل بیت (ع) کے کوئی خصوصی طرفدار نہیں ہیں اپنی معتبر ترین کتابوں میں جب اس آیت کی شان نزول بیان کرتے ہیں تو اسے اہل بیت ع پیغمبر ص کی فضیلت قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس واقعہ کے تحت یہ آیت نازل ہوئی اس میں حضرت علی ع، حضرت فاطمہ ع، حضرت حسن ع، حضرت حسین ع اور خود حضرت رسول اکرم ص موجود تھے اور اہل سنت کی احادیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو زوجۂ رسول اکرم ام سلمہ (۱)، آنحضرت ص کی خدمت میں آئیں اور عرض کی یا رسول اللہ (ص) "اہل بیت (ع)" میں

۱- یہ معظمہ شیعوں کے نزدیک بہت محترم ہیں۔ اور خدیجہ ع کے بعد پیغمبر اکرم (ص) کی سب

میرا بھی شمار ہے یا نہیں؟ آپ ؐ نے فرمایا تم خیر پر ہو لیکن ان میں شامل نہیں ہو۔ عرض کر چکا ہوں کہ اہل سنت کی روایات میں اس واقعہ کے حوالے ایک دو نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں یہی آیت ہمیں اپنے مفہوم سے مختلف دوسری آیات کے درمیان نظر آتی ہے۔ اس سے قبل و بعد کی آیتیں ازواج پیغمبر ؐ سے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے کی آیت یہ ہے "یَانِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ"[۱] اے ازواج پیغمبر ؐ! تم دوسری عورتوں جیسی نہیں ہو تم میں اور دوسری عورتوں میں فرق ہے، (یقیناً قرآن یہ نہیں کہنا چاہتا کہ تم دوسروں پر امتیاز رکھتی ہو)، تمہارا گناہ دگنا اور دوہرا ہے کیونکہ اگر تم گناہ کروگی تو ایک گناہ تو یہ ہے کہ تم نے وہ عمل بد انجام دیا اور دوسرے یہ کہ اپنے شوہر کی رسوائی کی مرتکب ہوئیں۔ اس طرح دو گناہ تم سے سرزد ہوئے۔ یوں ہی تمہارے نیک اعمال بھی دوہرا اجر رکھتے ہیں کیونکہ تمہارا ہر عمل خیر دو عمل کے برابر ہے۔ بالکل یوں ہی جیسے کہا جاتا ہے کہ سادات کرام کے کار خیر کا ثواب اور برے عمل کا گناہ دوہرا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا ایک گناہ سنگین ہو جاتا ہے اور فرق رکھتا ہے۔ بلکہ ان کا ایک گناہ دو گناہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سید (معاذ اللہ) شراب پیئے۔ تو وہ شراب پینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے عمل کا بھی مرتکب ہوا ہے، اور وہ یہ کہ چونکہ وہ پیغمبر ؐ اور آل پیغمبر ؐ سے منسوب ہے لہٰذا اپنی شراب نوشی کے ذریعہ پیغمبر (ص) کی ہتک و رسوائی کا مرتکب بھی ہوا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ پیغمبر ؐ کی اولاد اس قدر کھلم کھلا ان کے حکم کے خلاف عمل کر رہی ہے تو اس کی روح پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوگا۔

ان آیات میں تمام ضمیریں مؤنث کی استعمال ہوئی ہیں "لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ"۔ صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد ازواج پیغمبر اکرم ؐ ہیں۔ دو

سے زیادہ جلیل المرتبت زوجہ ہیں۔ اہل سنت کے یہاں بھی بہت محترم ہیں اور ان کی نگاہ میں خدیجہ ؑ و عائشہ کے بعد ام سلمہ ہی معظم و محترم خاتون ہیں۔

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۲

تین فقروں کے بعد یک بیک ضمیر مذکر ہو جاتی ہے اور ہم اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں،
"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ (عَنْکُنَّ نہیں ہے) الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ
یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْراً " اس کے بعد دوبارہ مؤنث کی ضمیریں استعمال ہونے لگتی ہیں
قرآن کا کوئی لفظ عبث اور غلط نہیں ہے۔ اولاً یہاں کلمہ "اہل البیت" استعمال ہوا ہے۔
اور اس کے پہلے ازواج رسول کا تذکرہ ہے "یانِسَاءَ النَّبِی" یعنی "نساء النبی" کا
عنوان "اہل البیت" میں تبدیل ہوگیا اور دوسرے مؤنث کی ضمیر مذکر میں تبدیل ہوگئی
یہ سب لغو اور عبث نہیں ہے۔ ضرور کوئی دوسری چیز ہے۔ یعنی قرآن گذشتہ آیات
سے الگ کوئی دوسری بات کہنا چاہتا ہے۔ آیت تطہیر سے قبل و بعد کی آیتوں میں ازواجِ
پیغمبر اکرم (ص) کے لئے حکم، دھمکی اور خوف و رجاء کا انداز پایا جاتا ہے؛ وَقَرْنَ فِی
بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ "، اپنے گھروں میں رہو اور زمانہ جاہلیت
کے مانند اپنے بناؤ سنگھار کو دکھاتی نہ پھرو۔ گویا ایک کے بعد ایک حکم اور تہدید و دھمکی
ہے۔ ساتھ ہی خوف و رجاء بھی ہے کہ اگر نیک اعمال بجالاؤ گی تو ایسا ہوگا اور اگر برے
اعمال کروگی تو ویسا ہوگا۔

یہ آیت یعنی (آیت تطہیر) مدح سے بالاتر ایک بات ہے قرآن اس میں اہل بیت کی گناہ و معصیت
سے پاکیزگی اور طہارت کے مسئلہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ اس آیت کا مفہوم اس سے پہلے اور بعد کی
آیتوں کے مفہوم و مطلب سے ایکدم الگ ہے۔ یہاں اہل بیت ؑ سے خطاب ہو رہا ہے اور وہاں
ازواج رسول ؐ سے۔ یہاں مذکر کی ضمیر ہے اور وہاں مؤنث کی۔ لیکن یہی آیت (تطہیر)
جس کا مفہوم و مطلب پہلے اور بعد کی آیتوں سے اس قدر مختلف ہے، ان آیات کے درمیان
میں قرار دی گئی ہے۔ اس کی مثال اس شخص کے مانند ہے جو اپنی گفتگو کے دوران
الگ سے ایک بات کہہ کر گفتگو کے سلسلہ کو پھر جوڑ دیتا ہے۔ اور اپنی بات جاری رکھتا ہے
یہی وجہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی روایات میں بڑی تاکید سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ممکن
ہے قرآنی آیات کی ابتدا میں کوئی ایک مطلب بیان ہوا ہو۔ درمیان میں کوئی دوسرا
مطلب اور آخر میں کوئی تیسری بات کہی گئی ہو۔ اور قرآن کی تفسیر کے مسئلہ کو ان

حضرات نے جو اتنی اہمیت دی ہے اس کا سبب بھی یہی ہے ۔

یہ بات صرف ہماری روایات اور ائمہؑ کے ارشادات میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اہل سنت حضرات نے بھی ان تمام مطالب کو نقل کیا ہے کہ "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ ۔۔۔۔" اپنے پہلے اور بعد کی آیتوں سے فرق رکھتی ہے ۔ اس آیت کا مضمون اور اس کے مخاطب بھی الگ ہیں ۔ یہ آیت ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو اس واقعہ (کساء) میں شامل ہیں ۔

دوسرا نمونہ

آیت "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" میں بھی ہمیں یہی بات نظر آتی ہے ۔ بلکہ یہاں مذکورہ بالا آیت تطہیر سے زیادہ عجیب انداز نظر آتا ہے ۔ اس سے پہلے کی آیت میں بہت ہی سادے اور معمولی مسائل ذکر کیے گئے ہیں "اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ" (۱) چوپایوں کا گوشت تمہارے لئے حلال ہے ، ان کا تزکیہ یوں کرو اور اور اگر مردار ہو تو حرام ہے ۔ وہ جانور جنہیں تم دم گھونٹ کر مار ڈالتے ہو (مُنْخَنِقَة) حرام ہیں اور وہ جانور جو ایک دوسرے کے سینگ مارنے سے مرجاتے ہیں ان کا گوشت حرام ہے اور ۔۔۔ پھر یک بیک ارشاد ہوتا ہے "اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" اس کے بعد دوبارہ مسائل کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جو پہلے بیان ہو رہے تھے ۔ مذکورہ آیت کے یہ جملے اپنے پہلے اور بعد کی آیتوں سے سرے سے میل نہیں کھاتے ۔ یعنی یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ یہ وہ بات ہے جو دوسرے مطالب کے درمیان الگ سے سرسری طور پر بیان کر دی گئی ہے اور پھر اسے ذکر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں ۔ اس وقت ہم جس آیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں (آیت بَلِّغْ) اس کا بھی یہی حال ہے ۔ یعنی وہ

---

۱ ۔ سورۂ مائدہ ، آیت نمبر ۱

بھی ایسی آیت ہے کہ اگر ہم اسے اس سے پہلے اور بعد کی آیات کے درمیان سے نکال دیں تو بھی اُن آیتوں کا ربط کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتا۔ جیسے کہ آیت "الیومَ اَکملتُ" کو اس کی جگہ سے ہٹا دیں تو اس سے پہلے اور بعد کی آیتوں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا یوں ہی زیر بحث آیت میں دوسری آیات کے درمیان ایک ایسی آیت ہے کہ نہ اسے ماقبل کی آیتوں سے متعلق کہا جا سکتا ہے اور نہ مابعد کی آیتوں کا مقدمہ ، بلکہ اس میں ایک دم الگ سے بات کہی گئی ہے ۔ یہاں بھی خود آیت میں موجود قرائن اور شیعہ وسنی روایات اسی مطلب کی حکایت کرتی نظر آتی ہیں ، لیکن اس آیت کو بھی قرآن نے ایسے مطالب کے درمیان رکھا ہے جو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے اس میں ضرور کوئی راز ہوگا ، آخر اس کا راز کیا ہے ؟

اس مسئلہ کا راز : اس میں جو راز پوشیدہ ہے ، خود قرآن کی آیت کے اشارے سے بھی ظاہر ہے اور ہمارے ائمہ (ع) کی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و دستورات میں آلِ پیغمبرؐ کا مسئلہ یعنی امیر المومنینؑ کی امامت اور خاندان پیغمبرؐ کی خصوصیت ہی ایسا مسئلہ اور ایسا حکم تھا جس پر بدقسمتی سے سب سے کم عمل ہو سکا ۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ اہل عرب اپنی روح کی گہرائیوں میں تعصبات رکھتے تھے جس کے سبب ان میں اس مطلب کے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی آمادگی بہت ہی کم نظر آتی تھی اگرچہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں امیر المومنینؑ سے متعلق حکم پہنچتے تھے لیکن حضرتؐ ہمیشہ اس تردد میں رہتے تھے کہ اگر میں حکم بیان کردوں تو وہ منافقین جن کا ذکر قرآن برابر کرتا رہا ہے کہنے لگیں گے کہ دیکھو! پیغمبرؐ کنبہ نوازی سے کام لے رہے ہیں ۔ جبکہ پوری زندگی پیغمبر اکرم (ص) کا یہ شیوہ رہا کہ کسی مسئلہ میں اپنے لئے کسی خصوصیت کے قائل نہ ہوئے ۔ ایک تو آپ کا اخلاق ایسا تھا ، دوسرے اسلام کا حکم ہونے کی بنا پر بھی آپؐ اس بات سے غیر معمولی طور پر گریز کرتے تھے کہ اپنے اور دوسروں کے درمیان کوئی امتیاز برتیں اور یہی پہلو پیغمبر اسلام (ص) کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا۔

یہ مسئلہ (یعنی اس حکم کی تبلیغ کہ علیؑ میرے جانشین ہیں) خدا کا حکم تھا، لیکن پیغمبرؐ جانتے تھے کہ اگر اسے بیان کر دیں تو ضعیف الایمان افراد کا گروہ جو ہمیشہ رہا ہے، کہنے لگے گا کہ دیکھو! پیغمبرؐ اپنے لئے عظمت و امتیاز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" میں ہم نے دیکھا کہ اس سے قبل کی آیت "اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ" تھی۔ جس میں قرآن فرماتا ہے کہ اب کافروں کی امیدیں تمہارے دین سے منقطع ہو چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کے خلاف اب تک جو جد و جہد کر رہے تھے کہ اس دین پر کامیاب ہو جائیں گے ان کی یہ امیدیں اب ٹوٹ چکی ہیں اور وہ مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ یہ سمجھ گئے ہیں کہ اب ان کے بگاڑے کچھ بگڑ نہیں سکتا۔ "فَلَا تَخْشَوْهُمْ" لہٰذا اب کافروں کی جانب سے کسی طرح کا خوف و خطر نہ رکھو "وَاخْشَوْنِ" لیکن مجھ سے ڈرتے رہو۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا مطلب ہے اس بات سے ڈرتے رہو کہ اگر تم میں خود اندرونی طور پر خرابیاں پیدا ہوئیں تو میں اپنی سنت اور قانون کے مطابق یعنی جب بھی کوئی قوم (فساد اور برائی میں پڑ کر) اپنی راہ بدلتی ہے میں بھی ان سے اپنی نعمت سلب کر لیتا ہوں۔ (نعمت اسلام کو تم سے سلب کر لوں گا) یہاں "وَاخْشَوْنِ" کنایہ ہے۔ مجھ سے ڈرو کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ سے ڈرو یعنی اب خطرہ اسلامی معاشرہ کے اندر سے ہے باہر سے کوئی خطر نہیں رہ گیا ہے۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آیت سورۂ مائدہ کی ہے اور سورۂ مائدہ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والا آخری سورہ ہے۔ یعنی یہ آیت پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے دو تین ماہ پہلے نازل ہونے والی آیتوں میں سے ہے جب اسلام طاقت و اقتدار کے اعتبار سے وسعت پا چکا تھا۔

جو آیت ہماری بحث کا محور ہے اور جسے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، اس میں بھی یہی بات نظر آتی ہے کہ خطرہ داخلی طور پر ہے خارجی طور پر کسی طرح کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ ارشاد ہے: "یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ"۔ ہمیں قرآن میں اس آیت کے علاوہ کوئی اور آیت نظر نہیں آتی جو پیغمبر اکرمؐ کو (کسی عمل کی انجام دہی کے لئے) آمادہ کرے

اور شوق دلائے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آپ کسی کو کسی کام کے لئے تشویق کیجیے اور وہ اس کے لئے ایک قدم آگے بڑھے پھر ایک قدم پیچھے ہٹ جائے جیسے وہ خطرے یا تذبذب کا شکار ہے۔ یہ آیت بھی پیغمبرؐ کو تبلیغ کی دعوت دیتی ہے اور اس تبلیغ کے سلسلہ میں ایک طرف دھمکی دیتی ہے اور دوسری طرف شوق پیدا کراتی اور تسلی دیتی ہے۔ دھمکی یہ ہے کہ اگر اس امر کی تبلیغ تم نے نہیں کی تو تمہاری رسالت کی تمام خدمت اکارت اور بے کار ہے اور تسلی یوں دی جاتی ہے کہ ڈرو نہیں! خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ "وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ"، آیت "اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ" میں فرمایا آپ کافروں سے خوف زدہ نہ ہو۔ درحقیقت پہلی منزل میں پیغمبر کو کافروں سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ لیکن آیت "یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ ...." سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ بیمناک اور فکرمند تھے۔ پس ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کا یہ تردد و فکرمندی مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے افراد سے ہے۔ مجھے فی الحال اس سے سروکار نہیں ہے کہ مسلمانوں میں وہ لوگ (جو اس تبلیغ یعنی علیؑ کی جانشینی قبول کرنے پر تیار نہیں تھے) باطنی طور پر کافر تھے یا نہیں تھے۔ بہرحال یہ مسئلہ کچھ ایسا تھا کہ وہ لوگ اس کے لئے آمادہ اور اسے قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔

تاریخی مثالیں

اتفاق سے تاریخی واقعات اور اسلامی معاشرہ کے مطالعہ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے چنانچہ عمر نے کہا کہ: ہم نے جو علیؑ کو خلافت کے لئے منتخب نہیں کیا وہ "حِیْطَۃً عَلَی الْاِسْلَامِ" تھا، یعنی ہم نے اسلام کے حق میں احتیاط سے کام لیا کیونکہ لوگ ان کی اطاعت نہیں کرتے اور انہیں (خلیفہ) نہیں مانتے!! یا ایک دوسری جگہ ابن عباس سے گفتگو کے دوران ان سے کہا: قریش کی نگاہ میں یہ عمل صحیح نہیں تھا کہ امامت بھی اسی خاندان میں رہے جس خاندان میں نبوت تھی۔ مطلب یہ تھا کہ نبوت جب خاندان بنی ہاشم میں ظاہر ہوئی تو فطری طور پر یہ اس خاندان کے لئے امتیاز بن گئی

لہٰذا قریش نے سوچا کہ اگر خلافت بھی اسی خاندان میں ہوگی تو سارے امتیازات بنی ہاشم کو حاصل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش کو یہ مسئلہ (خلافت امیرالمؤمنین) ناگوار تھا اور وہ اسے درست نہیں سمجھتے تھے۔ ابن عباس نے بھی ان کو بڑے ہی محکم جواب دیئے اور اس سلسلہ میں قرآن کی وہ آیتیں پیش کیں جو ان افکار و خیالات کا مدلل جواب ہیں۔

بہرحال اسلامی معاشرہ میں ایک ایسی وضع و کیفیت پائی جاتی تھی جسے مختلف عبارتوں اور مختلف زبانوں میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن اُسے ایک صورت اور ایک انداز سے بیان کرتا ہے اور عمر اسی کو دوسری صورت سے بیان کرتے ہیں یا مثال کے طور پر لوگ یہ کہتے تھے کہ چونکہ علیؑ نے اسلامی جنگوں میں عرب کے بہت سے افراد اور سرداروں کو قتل کیا تھا اور اہل عرب فطرتاً کینہ جو ہوتے ہیں لہٰذا مسلمان ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں علیؑ سے متعلق بدر کشی اور برادر کشی کا کینہ موجود تھا (لہٰذا علیؑ خلافت کے لئے مناسب نہیں ہیں) بعض اہل سنت بھی اسی پہلو کو بطور عذر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ اس منصب کے لئے علیؑ کی افضلیت سب پر نمایاں اور ظاہر تھی لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی تھا کہ ان کے دشمن بہت تھے۔

بنابرایں اس حکم سے سرتابی کے لئے ایک طرح کے تکدر و تردد کی فضا عہد پیغمبر میں ہی موجود تھی اور شاید قرآن کا ان آیات کو قرائن و دلائل کے ساتھ ذکر کرنے کا راز یہ ہے کہ ہر صاف دل اور بے غرض انسان حقیقی مطلب کو سمجھ جائے لیکن ساتھ ہی قرآن یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس مطلب کو اس طرح بیان کرے کہ اس سے انکار و روگردانی کرنے والوں کا انحراف قرآن اور اسلام سے انحراف و انکار کی شکل میں ظاہر ہو۔ یعنی قرآن یہ چاہتا ہے کہ جو لوگ بہرحال اس مطلب سے سرتابی کرتے ہیں ان کا یہ انحراف قرآن سے کھلم کھلا انحراف و انکار کی شکل میں ظاہر نہ ہو بلکہ کم از کم ایک ہلکا سا پردہ پڑا رہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ آیت تطہیر کو ان آیات کے درمیان میں قرار دیا گیا ہے لیکن ہر سمجھدار، عقلمند اور مدبر انسان بخوبی سمجھ جاتا ہے کہ یہ ان سے الگ ایک دوسری ہی بات ہے۔ اسی طرح قرآن نے آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ" اور آیت "یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ" کو بھی اسی انداز میں دوسری آیتوں کے درمیان ذکر کیا

آیت اِنّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ

اس سلسلہ میں بعض ایسی آیتیں بھی ہیں جو انسان کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ یہاں ضرور کوئی خاص بات ذکر کی گئی ہے اور بعد میں متواتر احادیث و روایت سے بات ثابت ہو جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر آیت : "اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ" (مائدہ/۵۵) عجیب تعبیر ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔ "تمہارا ولی خدا ہے اور ان کا رسول اور وہ صاحبانِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ۔ حالت رکوع میں زکوٰۃ دینا کوئی معمولی عمل نہیں ہے جسے ایک اصلِ کلی کے طور پر ذکر کیا جائے بلکہ یہ مطلب و مفہوم کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔ یہاں اس کی تصریح و وضاحت بھی نہیں کی گئی ہے کہ اس سے سرتابی دوست و دشمن کے نزدیک براہِ راست قرآن سے روگردانی شمار کی جائے ۔ لیکن ساتھ ہی کمالِ فصاحت کے ساتھ اسے اس انداز سے بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ ہر صاف دل اور منصف مزاج انسان سمجھ جائے کہ یہاں کوئی خاص چیز بیان کی گئی ہے اور کسی اہم قضیہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے ۔

"اَلَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ ۔ وہ لوگ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں" یہ کوئی عام سی بات نہیں ہے بلکہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو وجود میں آگیا ــــ آخر یہ کون سا واقعہ تھا ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ بلا استثنا تمام شیعہ و سنی روایات کہتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ بن ابی طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔

عرفا کی باتیں

دوسری آیتیں بھی ہیں جن پر گہرائی کے ساتھ غور و فکر سے مطلب واضح اور حقیقت روشن ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عرفا ایک زمانہ سے اس سلسلہ میں اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں ۔ دراصل یہ شیعی نقطۂ نظر ہے لیکن عرفا نے اسے بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ امامت و ولایت کا مسئلہ باطن شریعت سے تعلق رکھتا ہے ۔ یعنی وہی اس تک رسائی

حاصل کرسکتا ہے جو کسی حد تک شریعت اور اسلام کی گہرائیوں سے آشنا ہو یعنی اس نے پوست اور چھلکے سے گزر کر اس کے مغز و جوہر تک رسائی حاصل کرلی ہو اور بنیادی طور پر اسلام میں امامت و ولایت کا مسئلہ لُبّی اور اصل مسئلہ رہا ہے یعنی بہت مدبرانہ فکر عمیق رکھنے والے افراد ہی اسے درک اور سمجھ سکے ہیں۔ دوسروں کو بھی اس گہرائی کے ساتھ غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس مفہوم تک پہنچتے ہیں اور کچھ نہیں پہنچ پاتے۔

اب ہم اس سے متعلق بعض دیگر آیات پر توجہ دیتے ہیں ہمارا مقصود یہ ہے کہ شیعہ جو دلائل پیش کرتے ہیں ہم ان سے آگاہ ہوں اور ان کی منطق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

امامت شیعوں کے یہاں نبوّت سے ملتا جلتا مفہوم

قرآن میں ایک آیت ہے جو ان ہی مذکورہ آیات کے سلسلہ کا ایک حصّہ بھی ہے اور بظاہر عجیب آیت ہے۔ البتہ یہ خود امیر المؤمنین؏ کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ مسئلۂ امامت سے متعلق ہے، ان ہی معنیٰ میں ہے جسے ہم ذکر کر چکے ہیں اور یہاں اشارتاً اسے دوبارہ ذکر کرتے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عہدِ قدیم سے ہی اسلامی متکلّمین کے درمیان ایک بہت بڑا اشتباہ موجود رہا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس مسئلہ کو اس انداز میں اٹھایا ہے کہ: امامت کے شرائط کیا ہیں؟ انہوں نے مسئلہ کو یوں فرض کیا کہ امامت کو ہم بھی قبول کرتے ہیں اور اہل سنت بھی لیکن اس کے شرائط کے سلسلہ میں ہم دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ ہم کہتے ہیں شرائط امام یہ ہیں کہ وہ معصوم ہو اور منصوص ہو یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے معیّن و مقرر کیا گیا ہو۔ اور وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے جبکہ شیعہ جس امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں، اہل سنت سرے سے اس کے معتقد نہیں ہیں اہل سنت امامت کے عنوان سے جس چیز کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ امامت کی دنیوی حیثیت ہے جو مجموعی طور سے امامت کا ایک پہلو ہے جیسے نبوت کے سلسلہ میں ہے

پیغمبر اکرمؐ کی ایک شان یہ بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے حاکم تھے لیکن نبوت خود حکومت کے مساوی اور ہم پلہ نہیں ہے۔ نبوت خود ایک ایسی حقیقت اور ایسا منصب ہے جس کے ہزاروں پہلو اور ہزاروں معانی و مطالب ہیں۔ پیغمبر کی شان یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی اور مسلمانوں کا حاکم نہیں ہو سکتا۔ وہ نبیؐ ہونے کے ساتھ مسلمانوں کا حاکم بھی ہے، اہل سنت کہتے ہیں کہ امامت کا مطلب حکومت ہے اور امام وہی ہے جو مسلمانوں کے درمیان حاکم ہو۔ یعنی مسلمانوں میں کی ایک فرد جسے حکومت کے لئے انتخاب کیا جائے گویا یہ لوگ امامت کے سلسلہ میں حکومت کے مفہوم سے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن یہی امامت شیعوں کے یہاں ایک ایسا مسئلہ ہے جو بالکل نبوت کے ہی قائم مقام قدم بقدم ہے بلکہ نبوت کے بعض درجات سے بھی بالاتر ہے یعنی انبیاءِ اولو العزم وہی ہیں جو امام بھی ہیں۔ بہت سے انبیاء امام تھے ہی نہیں۔ انبیاء اولو العزم اپنے آخری مدارج میں منصب امامت پر سرفراز ہوئے ہیں۔

غرض یہ کہ جب ہم نے اس حقیقت کو مان لیا کہ جب تک پیغمبر موجود ہے کسی اور کے حاکم بننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کیونکہ وہ بشریت سے مافوق ایک پہلو کا حامل ہے، یوں ہی جب تک امام موجود ہے حکومت کے لئے کسی اور کی بات ہی پیدا نہیں ہوتی۔ جب وہ نہ ہو (چاہے یہ کہیں کہ بالکل سے موجود ہی نہیں ہے یا ہمارے زمانہ کی طرح نگاہوں سے غائب ہے) اس وقت حکومت کا سوال اٹھتا ہے کہ حاکم کون ہے؟ ہمیں مسئلہ امامت کو مسئلہ حکومت میں مخلوط نہیں کرنا چاہیئے کہ بعد میں یہ کہنے کی نوبت آئے کہ اہل سنت کیا کہتے ہیں اور ہم کیا کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ شیعہ کے یہاں امامت بالکل نبوت سے ملتا جلتا ایک مفہوم ہے اور وہ بھی نبوت کے عالی ترین درجات سے۔ چنانچہ ہم شیعہ امامت کے قائل ہیں اور وہ سرے سے اس کے قائل نہیں ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ قائل تو ہیں مگر امام کے لئے کچھ دوسرے شرائط تسلیم کرتے ہیں۔

امامت ابراہیمؑ کی ذریت میں

یہاں ہم جس آیت کی تلاوت کرنا چاہتے ہیں وہ امامت کے اسی مفہوم کو ظاہر کرتی ہے جسے شیعہ پیش کرتے ہیں۔ شیعہ کہتے ہیں، اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامت ایک الگ ہی

حقیقت ہے، جو نہ صرف پیغمبر اسلامؐ کے بعد بلکہ انبیاءؑ ماسلف کے زمانے میں بھی موجود رہی ہے اور یہ منصب حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں تا صبح قیامت باقی ہے وہ آیت یہ ہے: "وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ" (۱) جب خداوند عالم نے چند امور واحکام کے ذریعہ ابراہیم کو آزمایا اور وہ ان آزمائشوں میں پورے اُترے تو (خدا نے) فرمایا میں بلاشبہ تمہیں لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ (ابراہیمؑ نے) کہا: اور میری ذریت سے: فرمایا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہونچے گا۔

ابراہیم معرضِ آزمائش میں

حجاز کی جانب ہجرت کا حکم

خود قرآن حکیم نے جناب ابراہیمؑ کی آزمائشوں سے متعلق بہت سے مطالب ذکر کئے ہیں۔ نمرود اور نمرودیوں کے مقابلہ میں ان کی استقامت و پائداری کہ نارِ نمرودی میں جانے سے نہ ہچکچائے اور ان لوگوں نے انہیں آگ میں ڈال بھی دیا اور اس کے بعد پیش آنے والے دوسرے واقعات۔ ان ہی آزمائشوں میں خداوند عالم کا ایک عجیب وغریب حکم یہ بھی تھا جسے بجالانا سوائے اس شخص کے جو خدا کے حکم کے سامنے مطلق تعبد و بندگی کا جذبہ رکھتا ہو اور بے چون وچرا سرِ تسلیم خم کردے کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک بوڑھا جس کے کوئی اولاد نہ ہو اور ستر اسی سال کے سن میں پہلی مرتبہ اس کی زوجہ ہاجرہ صاحب اولاد ہوتی ہے اور ایسے میں اسے حکم ملتا ہے کہ شام سے ہجرت کرجاؤ اور حجاز کے علاقہ میں اس مقام پر جہاں اس وقت خانہ کعبہ ہے، اپنی اس بیوی اور بچہ کو چھوڑ دو اور خود وہاں سے واپس چلے آؤ۔ یہ حکم سوائے مطلق طور پر تسلیم و رضا کی منطق کے کہ چونکہ یہ حکم خدا ہے لہٰذا میں اسکی اطاعت کررہا

---

(۱) سورہ بقرہ آیت ۱۲۴

ہوں (جیسے حضرت ابراہیم نے محسوس کیا تھا کیونکہ آپ پر وحی ہوتی تھی) کسی اور منطق سے میل نہیں کھاتا۔

"رَبَّنَا اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (۱) پروردگارا! میں نے اپنی ذریت کو اس بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے نزدیک ٹھہرا دیا تاکہ یہ لوگ نماز ادا کریں۔ البتہ آپ خود وحی الٰہی کے ذریعہ یہ جانتے تھے کہ انجام کار کیا ہے؟ لیکن منزل امتحان سے بخوبی گزر گئے۔

بیٹے کو ذبح کر دو

ان سب سے بالاتر بیٹے کو ذبح کرنے کا مرحلہ ہے۔ آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو منیٰ میں ذبح کر دو۔ وہیں جہاں آج ہم جناب ابراہیمؑ کی اس بے مثال اطاعت و بندگی اور تسلیم و رضا کی یاد میں جانوروں کی قربانی کرتے ہیں (چونکہ خدا نے حکم دیا ہے لہٰذا انجام دیتے ہیں۔ یہاں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔) دو تین مرتبہ جب خواب کے عالم میں آپ پر وحی ہوتی ہے اور آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ وحی پروردگار ہے تو اپنے بیٹے کے سامنے یہ بات رکھتے ہیں اور اس سے مشورہ کرتے ہیں۔ بیٹا بھی بلا کسی حیل و حجت اور بہانے کے کہتا ہے: "یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" اے پدر بزرگوار جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے بجا لائیے "سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ" (۲) آپ انشاءاللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ قرآن کیسا عجیب اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے: "فَلَمَّآ اَسْلَمَا" جب یہ دونوں تسلیم ہو گئے یعنی جب انہوں نے ہمارے حکم کے آگے مکمل طور پر اطاعت و بندگی کا اظہار کیا: "وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ" اور ابراہیمؑ نے اپنے فرزند کو پیشانی کے بل لٹا یا (یعنی اس آخری مرحلہ پر پہنچ گئے جہاں نہ ابراہیمؑ کو بیٹے کے ذبح کرنے میں شک رہا اور نہ اسماعیلؑ کو ذبح ہو جانے میں کوئی شبہ باقی رہا باپ بھی اطمینان کامل کی منزل پر اور بیٹا بھی یقین کامل کے درجہ پر) "وَنَادَیْنٰہُ اَنْ

۱۔ سورۂ ابراہیم آیت ۳۷　　۲۔ سورۂ صافات آیت ۱۰۳-۱۰۲

یاابراھیم قد صدقت الرؤیا "(۱) تو ہم نے ندا دی اور وحی کی کہ اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یعنی ہمارا مقصد فرزند کو ذبح کرنا نہیں تھا۔ ہم نے نہیں چاہا تھا کہ اسماعیلؑ ذبح کر دیئے جائیں، یہ نہیں فرمایا کہ اس حکم کو عملی طور پر انجام دینا لازمی نہیں ہے بلکہ فرمایا تم نے انجام دے دیا، کام ختم ہو گیا، کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسماعیلؑ کو ذبح کر دیا جائے بلکہ ہمارا مقصد اسلام و تسلیم کی نمود اور تم دونوں باپ بیٹوں کی تسلیم و رضا کا اظہار تھا جو انجام پا گیا۔

قرآن کے مطابق خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو عالم پیری میں نعمت اولاد سے نوازا۔ قرآن حکایت کرتا ہے کہ جب فرشتوں نے آکر ان کو یہ خبر دی کہ خداوند عالم آپ کو فرزند عطا کرے گا تو ان کی زوجہ نے فرمایا: ءَ اَلِدُ وَ اَنَا عَجُوزٌ وَّھٰذا بَعلِی شَیخاً ..... " میں بوڑھی عورت صاحب اولاد ہوں گی جب کہ یہ میرا شوہر بھی، بوڑھا ہے؟ " قَالُوا اَتَعجَبِینَ مِنْ اَمرِ اللّٰہِ رَحمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہ عَلَیکُم اَھلَ البَیتِ " (۲) فرشتوں نے ان سے کہا، کیا آپ کو امر خدا پر تعجب ہے؟۔ اے اہل بیت آپ پر خدا کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہیں۔ بنابرایں خداوند عالم نے ابراہیمؑ کو بوڑھاپے میں اولاد عطا کی یعنی جب تک جوان تھے صاحب اولاد نہیں تھے۔ آپ اس وقت صاحب اولاد ہوئے جب منصب پیغمبری پر فائز ہو چکے تھے۔ کیونکہ جناب ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن کے اندر بہت سی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کے پیغمبر ہونے کے سالہا سال کے بعد زندگی کے آخری ایام یعنی ستر اسّی سال کے سن میں خداوند عالم انہیں نعمت اولاد سے نوازتا ہے اور آپ اس کے دس بیس سال بعد تک زندہ بھی رہتے ہیں یہاں تک کہ جناب اسماعیلؑ و جناب اسحٰقؑ بڑے ہو جاتے ہیں اور جناب اسماعیلؑ تو ان کی حیات میں اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر میں اپنے پدر بزرگوار کا ہاتھ بٹاتے ہیں

آیت: وَاِذِ ابتَلٰی اِبرَاھِیمَ رَبُّہ بِکَلِمَاتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً قَالَ وَمِن ذُرِّیَّتِی قَالَ لَا یَنَالُ عَھدِی الظّٰلِمِینَ "(۳) بتاتی

۱۔ سورۂ صٰفّٰت آیت ۱۰۴
۲۔ سورۂ ہود آیت نمبر ۷۲۔۷۳
۳۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴

ہے کہ خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو آزمائش میں مبتلا کیا۔ آپ نے ان آزمائشوں کو پورا کر دکھایا اور ان میں کھرے اترے اس کے بعد خداوند عالم نے فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا امام قرار دیتا ہوں جناب ابراہیمؑ نے دریافت کیا، کیا میری ذریّت سے بھی یہ منصب متعلق رہے گا؟ جواب ملا، میرا عہد (ان میں سے) ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یہ آیتیں کس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں؟ کیا جناب ابراہیمؑ کے اوائل زندگی سے؟ مسلّم طور پر نبوت سے پہلے کی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان آیتوں میں وحی کی بات کہی گئی ہے۔ بہرحال دوران نبوت سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیا یہ زمانہ نبوت کا ابتدائی زمانہ ہے؟ نہیں، بلکہ نبوت کا آخری زمانہ ہے۔ اس کی دو دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ آیت کہتی ہے کہ یہ منصب آزمائشوں کے بعد ملا اور جناب ابراہیمؑ کی تمام آزمائشیں آپ کی نبوت کے پورے دور میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے اہم ترین آزمائش آپ کے اواخر عمر سے متعلق رہی ہے اور دوسرے یہ کہ اسی آیت میں آپ کی ذریت اور اولاد کا تذکرہ بھی ہے۔ جیسا کہ ابراہیمؑ نے خود فرمایا "وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ آپ صاحب اولاد تھے۔

یہ آیت جناب ابراہیمؑ سے جو نبی بھی تھے اور رسول بھی، اب آخر عمر میں یہ کہتی ہے کہ ہم تمہیں ایک نیا عہدہ اور ایک دوسرا منصب دینا چاہتے ہیں۔: "اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" میں تمہیں لوگوں کا امام بنانا چاہتا ہوں۔" معلوم ہوا کہ ابراہیمؑ پیغمبر تھے۔ رسول تھے ۔ان مراحل کو طے کر چکے تھے، لیکن ابھی ایک مرحلہ اور تھا جس تک ابھی رسائی حاصل نہیں کر پائے تھے اور نہیں پہنچے جب تک تمام آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں گئے۔ کیا یہ بات یہ ظاہر نہیں کرتی کہ قرآن کی منطق میں منصب امامت ایک دوسری ہی حقیقت کا نام ہے؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ امامت کے معنی کیا ہے؟

امامت خدا کا عہد

امامت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس منزل پر فائز ہو کہ اصطلاحی زبان میں اُسے انسان کامل کہا جائے کہ یہ انسان کامل اپنے پورے وجود کے ساتھ دوسروں کی رہبری

ہدایت کا فریضہ انجام دے سکے ۔ جناب ابراہیمؑ کو فوراً اپنی ذریت اور اولاد یاد آتی ہے خدایا! کیا میری ذریت اور میری نسل کو بھی یہ منصب نصیب ہوگا؟ جواب دیا جاتا ہے: "لَایَنَالُ عَھْدِی الظّٰالِمِیْنَ" میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا ۔ یہاں امامت کو خدا کا عہد کہا گیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کہتے ہیں کہ ہم جس امامت کی بات کرتے ہیں وہ خدا کی جانب سے ہے ۔ چنانچہ قرآن بھی یہی فرماتا ہے "عَھْدِیْ" یعنی میرا عہد، نہ کہ عوام کا عہد جب ہم یہ سمجھ لیں گے کہ امامت کا مسئلہ حکومت کے مسئلہ سے جدا ہے ۔ تو اس پر تعجب نہ ہوگا کہ یہ عہد یعنی امامت خدا سے متعلق کیوں ہے؟ سوال یہ اٹھتا ہے کہ حکومت و حاکمیت خدا سے متعلق ہے یا انسانوں سے؟ جواب یہ ہے کہ یہ حکومت جسے ہم حکومت کہتے ہیں امامت سے الگ ایک چیز ہے ۔ امامت میرا عہد ہے اور میرا عہد تمہاری ظالم اور ستم گر اولاد تک نہیں پہنچے گا ۔ ابراہیمؑ کے سوال کا نہ کلی طور سے انکار کیا اور نہ کلی طور سے اقرار فرمایا ۔ جب قرآن نے ابراہیمؑ کی اولاد کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ظالم اور ستم گر افراد کو الگ کر دیا تو ان میں وہ افراد رہ جاتے ہیں جو ظالم و ستم گر نہیں ہیں ۔ اور اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسل ابراہیمؑ میں اجمالی طور سے امامت پائی جاتی ہے ۔

دوسری آیت

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک اور آیت: وَجَعَلَھَا کَلِمَةً بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِہٖ (۱) بھی جناب ابراہیمؑ سے متعلق ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: خداوند عالم نے اسے (یعنی امامت کو) ایک باقی اور قائم رہنے والی حقیقت کی صورت میں ابراہیمؑ کی نسل میں باقی رکھا ۔

ظالم سے کیا مراد ہے؟

یہاں "ظالمین" کا مسئلہ پیش آتا ہے ۔ ائمہ علیہم السلام نے ہمیشہ ظالمین سے

۱۔ سورہ زخرف آیت ۲۸

متعلق اس آیت سے استدلال کیا ہے ۔ ظالم سے مراد کیا ہے ؟ قرآن کی نگاہ میں ہر وہ شخص جو خود اپنی ذات پر یا دوسروں پر ظلم کرے، ظالم ہے ۔ عرفِ عام میں ہمیشہ ہم ظالم اسے کہتے ہیں جو دوسروں پر ظلم کرے یعنی جو لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے ہم اسے ظالم کہتے ہیں ، لیکن قرآن کی نظر میں ظالم عمومیت رکھتا ہے چاہے وہ دوسرے کے ساتھ ظلم کرے یا خود پر کرے جو شخص دوسروں پر ظلم کرتا ہے وہ بھی اپنے آپ پر ہی ظلم کرتا ہے ۔ قرآن میں اپنی ذات یا اپنے نفس پر ظلم کو بیان کرنے والی بہت سی آیتیں موجود ہیں ۔

علامہ طباطبائیؒ اپنے ایک استاد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے متعلق خداوند عالم سے جو سوال کیا ہے ، اس سلسلہ میں نسل و ذریت ابراہیمؑ کے نیک و بد ہونے کی تفسیر کچھ اس طرح ہوتی ہے ۔ ایک یہ کہ ہم فرض کریں کہ حضرت کی اولاد میں کچھ ایسے افراد تھے جو ابتدا سے آخر عمر تک ہمیشہ ظالم تھے ۔ دوسرے یہ کہ بعض ایسے افراد تھے جو ابتدائے عمر میں ظالم تھے لیکن آخر عمر میں نیک اور صالح ہو گئے ۔ تیسرے کچھ افراد وہ تھے جو ابتدائے عمر میں نیک تھے اور بعد میں ظالم ہو گئے ۔ اور چوتھے یہ کہ کچھ افراد ایسے بھی تھے جو کبھی ظالم نہ تھے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ جناب ابراہیمؑ منصب امامت کی عظمت و جلالت کو سمجھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ منصب اتنا اہم ہے جو نبوت و رسالت کے بعد آپ کو عطا کیا گیا ہے ، لہٰذا محال ہے کہ ایسے منصب کی درخواست خداوند عالم سے آپ نے اپنی ان اولاد کے لئے کی ہو جو ابتدا سے آخر عمر تک ظالم اور بدکار تھے ۔ یوں ہی یہ بھی محال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ تقاضا اپنے ان فرزندوں کے لئے ہو جو ابتدائے عمر میں تو نیک تھے لیکن جب انہیں منصب دیا جانے والا ہو تو ظالم ہوں ۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے یہ تقاضا اپنی صالح اور نیک اولاد کے لئے کیا ہے ۔ اب ان نیک اور صالح افراد کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وہ جو ابتدا سے زندگی کے آخری لمحہ تک ہمیشہ نیک رہے اور ایک وہ جو پہلے ظالم اور بُرے تھے اب نیک اور صالح ہو گئے ۔ جب یہ طے ہو گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کا تقاضا ان دو طرح کے افراد کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتا ، تو اب ممکن ہے کہ یہ منصب ان افراد کو نصیب ہو جو اگرچہ اس وقت ظالم و ستمگر نہیں ہیں لیکن ان کی گذشتہ زندگی آلودہ اور ظالمانہ تھی ۔ یعنی ان

کی زندگی کا پچھلا ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔ (لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ) قرآن صاف طور سے فرماتا ہے:
"لَایَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ" جو لوگ ظلم سے سابقہ رکھتے ہیں اس منصب کے اہل نہیں
ہوسکتے۔ ہمارا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ لہٰذا مسلّم طور پر وہ شخص جو اس وقت ظالم ہے
یا ہمیشہ ظالم رہا ہے یا پہلے ظالم نہیں تھا لیکن اس وقت ظالم ہے، ان میں سے کوئی ایک
حضرت ابراہیمؑ کی درخواست کا مصداق نہیں ہے۔ اس بنا پر قرآن صاف طور پر اس کی نفی کرتا ہے
کہ امامت اس شخص تک پہنچے جس کی پچھلی زندگی ظالمانہ رہی ہو۔
یہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر شیعہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ
امامت ان لوگوں تک بھی پہنچے جو اپنی زندگی کے کسی دور میں مشرک رہے ہوں۔

سوال و جواب

سوال: معصوم کا کیا مطلب ہے؟ یہ ہماری شیعہ منطق کا ساختہ و پرداختہ کوئی
کوئی مفہوم ہے یا اس کی کچھ بنیادیں ہیں اور ہم نے انہیں پروان چڑھا کر بہتر بنایا ہے؟ اصولی
طور پر کیا معصوم اس شخص کو کہتے ہیں جو گناہ نہ کرے، یا اسے کہتے ہیں جو گناہ کے علاوہ کوئی
اشتباہ یا غلطی بھی نہ کرتا ہو؟
ہم بیس سال پہلے میرزا ابوالحسن خان فروغی مرحوم کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے
یہ بزرگوار خاص طور سے عصمت کے مسئلہ میں خصوصی اور وسیع مطالعہ اور خاص عقیدہ
رکھتے تھے، اور اس موضوع پر بہترین انداز میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے
اگرچہ ہم اس وقت ان کی اسّی فی صد گفتگو سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اس میں سے بیس فی صد
جو سمجھتے تھے، اس کے مطابق وہ عصمت کی ایک دوسرے انداز میں تعریف کرتے تھے
وہ فرماتے تھے، معصوم وہ نہیں ہے جو گناہ نہ کرے۔ ہماری نگاہ میں بہت سے ایسے افراد
ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں گناہ ہی نہیں کیا۔ لیکن انہیں معصوم نہیں کہتے۔ اس
وقت ہمیں اس فکر سے سروکار نہیں ہے۔ آقائے مطہری کے پاس یقیناً اس کا جواب ہوگا
کہ معصوم سے کیا مراد ہے؟ اگر معصوم وہ شخص ہے جس سے کبھی کوئی غلطی یا بھول چوک

بھی نہ ہوئی ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ بارہ ائمہ علیہم السلام میں سے صرف دو حضرات مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے : حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ اور وہ بھی بڑی مختصر مدت کے لئے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان حضرات سے خلافت کے معاملات اور حکومت چلانے کے سلسلہ میں بہت سے اشتباہ ہوئے اور تاریخی نقطۂ نظر سے ان اشتباہات اور غلطیوں میں کسی شک وشبہ کی گنجائش بھی نہیں ۔ اور یہ بات معصوم کی مذکورہ بالا تعریف سے کسی طرح میل نہیں کھاتی ۔

مثال کے طور پر امام حسن علیہ السلام کا عبیداللہ بن عباس کو معاویہ سے جنگ کے لئے مامور کرنا ۔ یا خود حضرت علی علیہ السلام کا عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا حاکم مقرر کرنا ۔ اگر آپ جانتے ہوتے کہ یہ شخص اس قدر رسوائی کا باعث ہوگا اور ایسی بدعملی کا مظاہرہ کرے گا تو یقیناً آپ یہ کام نہ کرتے ۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ آپ حقیقت سے واقف نہ تھے یعنی پہلے آپ کا خیال یہ تھا کہ میں نے جسے انتخاب کیا ہے وہ اس کام کے لئے بہترین شخص ہے ، لیکن بعد میں وہ شخص غلط نکلا ۔ اور اگر حضرتؑ کے دورۂ حکومت سے متعلق مزید تحقیق کی جائے تو یقیناً اس طرح کے اور بھی مسائل نظر آئیں گے اور تاریخی لحاظ سے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں ہے ، لیکن یہ بات عصمت کی اس تعریف سے بالکل میل نہیں کھاتی

اور یہ جو میں نے عرض کیا کہ بحث کرنے کا یک طرفہ انداز یعنی سارے موافق حضرات کا کسی بحث میں حصہ لینا زیادہ مفید نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعی جب انسان کوئی عقیدہ رکھتا ہے تو اسے دوست بھی رکھتا ہے اور اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ اپنے اس عقیدہ کے خلاف کچھ بھی سُنے ۔ خاص طور سے ہم جو بچپن سے ہی شیعیت اور خاندان علیؑ بن ابی طالب سے محبت اپنے دل میں رکھتے آئے ہیں اور کبھی اس کے خلاف تنقید نہیں سنی ہے ۔ شاید خود دین واصولِ دین یہاں تک کہ توحید وخدا پرستی سے متعلق اعتراضات یا تنقیدیں تو آسانی سے سن لی ہوں لیکن تشیع اور ائمہ علیہم السلام پر تنقید یا کسی کا ان حضرات کی زندگی کہ انہوں نے یہ کام کیوں کیا اور وہ کیوں نہ کیا ، سے ہمارے کان آشنا نہیں ہیں ، اسی وجہ سے اگر کوئی مثال کے طور پر امام حسنؑ کے عمل یا امام حسینؑ کے اقدام پر اعتراض کرے تو ہمیں بہت

شاق گزرتا ہے ۔

لیکن مثال کے طور پر یہ آیت جسے آقائے مطہری نے پہلے جلسہ میں اور اس جلسہ میں موضوع قرار دیا ہے ۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے " وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات ادا کرتے ہیں "۔ اس کے بعد آپ نے استدلال فرمایا کہ یہ آیت اس واقعہ کے تحت جس میں حضرت علیؑ نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی سائل کو دی تھی، سوائے حضرت علیؑ کے کسی اور کے بارے میں نہیں ہے ۔ میری نظر میں یہ بات کچھ منطقی اور معقول نہیں لگتی ، کیونکہ اول تو ہم نے امیرالمؤمنینؑ کی زندگی کے بارے میں یہ پڑھا اور سنا ہے کہ نماز کی حالت میں آپ کی توجہ خداوند عالم کی جانب اس قدر ہوا کرتی تھی کہ گردوپیش کے لوگوں سے بے خبر ہو جاتے تھے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وضو کرتے وقت بھی اگر آپ کے سامنے سے لوگ گزر جاتے تھے تو آپ انھیں پہچان نہیں پاتے تھے ۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نماز کی حالت میں ایسے شخص کے حواس اس قدر دوسروں کی طرف متوجہ ہوں کہ سائل مسجد میں وارد ہوتا ہے ، سوال کرتا ہے ، کوئی اسے کچھ نہیں دیتا اور حضرت اپنی انگوٹھی اتار کر اس کے حوالہ کر دیتے ہیں ۔ مزید یہ کہ سائل کو پیسے دینا کوئی اچھی بات بھی نہیں ہے ۔ سائل کو پیسہ دینا اس قدر اہم نہیں ہے کہ انسان اپنی نماز کو کم از کم باطنی اور روحانی اعتبار سے ہی ناقص کر دے یا اس میں خلل پیدا کرے ؟

اس کے علاوہ زکات کا تعلق انگوٹھی سے نہیں ہے اور فقہائے شیعہ کے فتووں کے مطابق زکوٰۃ سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں شامل بھی نہیں ہے ۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر وہ افراد جو اس سلسلہ میں کٹر ہیں اس موضوع کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے یہ بھی فرما گئے ہیں کہ یہ انگوٹھی بہت زیادہ قیمتی تھی ۔ جبکہ حضرت علیؑ نے قیمتی انگوٹھی نہیں پہنی ۔ ؟

جواب : جس نکتہ کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایا کہ جلسہ میں مخالف موقف رکھنے والے افراد بھی ہونے چاہئے یقیناً تمام جلسوں کے لئے یہ ایک مفید فکر ہے اور میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ کام اچھا اور مفید ہے ۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ عصمت کیا ہے ؟ تو اس سلسلہ میں اکثر انسان یہ خیال کرتا ہے کہ عصمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں بعض مخصوص افراد کی ہمیشہ نگرانی کیا کرتا ہے کہ جیسے ہی وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتے ہیں فوراً انھیں روک دیتا ہے ۔ مسلّم طور پر عصمت کے یہ معنی نہیں ہیں ۔ اور اگر ہوں بھی تو یہ کسی کے لئے کمال کی بات نہیں ہے ۔ اگر کسی بچہ پر ایک شخص برابر نگرانی رکھے اور اسے کوئی غلط کام کرنے نہ دے تو یہ اس بچہ کے لئے کوئی کمال شمار نہ ہوگا ۔ لیکن عصمت کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو قرآن سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ صدیق کے بارے میں اس سخت منزل میں جب زلیخا ان کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی ، فرماتا ہے :

"وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ یعنی اس عورت نے یوسف کا ارادہ کیا۔
وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ" (۱) اور یوسف بھی اگر دلیل پروردگار کا مشاہدہ نہ کرتے ہوتے تو اس کا ارادہ کرتے ۔

یعنی وہ بھی ایک انسان تھے ، جوان تھے اور جذبات رکھتے تھے ۔ زلیخا یوسفؑ کی طرف بڑھی لیکن یوسفؑ اس کی طرف نہیں بڑھے ۔ یوسفؑ بھی اگر شہود کی منزل پر نہ ہوتے یعنی اس عمل کی حقیقت کو اپنے سامنے ظاہر و عیاں نہ دیکھتے تو اس کی طرف مائل ہو جاتے ۔ حضرت یوسف چونکہ صاحب ایمان تھے اور آپ کا ایمان کامل تھا اور ایمان شہودی کی حد کو پہنچا ہوا تھا ۔ یعنی گویا وہ اس عمل کی اچھائی اور برائی کو دیکھ رہے تھے ۔ وہ ایمان جو خدا نے یوسفؑ کو عطا کیا تھا ، وہی ایمان آپ کو اس عمل سے روک رہا تھا ہم میں کا ہر شخص کسی طاقت کے روکے ٹوکے بغیر بعض لغزشوں اور گناہوں سے معصوم ہے اور یہ ہمارے اس ایمانی کمال کا نتیجہ ہے جو ہم ان گناہوں کے خطرات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مثال کے طور پر کسی چار منزلہ عمارت کی چھت سے چھلانگ لگانا ۔ یا آگ میں کود پڑنا یہ بھی گناہ ہیں لیکن ہم ہرگز ان گناہوں کے مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ ان کے خطرات و نقصان

---

۱ ۔ سورہ یوسف آیت ۲۴

ہمارے لئے ثابت اور ایک دم عیاں ہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ ادھر ہم نے بجلی کے ننگے تار کو چھوا ادھر ہماری جان گئی ۔ ہم صرف اسی وقت اس گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں جب ان خطرات سے آنکھیں بند کریں ، لیکن ایک بچہ دہکتے ہوئے انگارہ پر ہاتھ مارتا ہے ۔ کیوں ؟ اس لئے کہ اس خطرہ کا گناہ جس قدر ہم پر ثابت و عیاں ہے اس پر عیاں نہیں ہے ایک عادل انسان تقویٰ کا ملکہ رکھتا ہے اسی بنا پر بہت سے گناہ وہ سرے سے انجام ہی نہیں دیتا ۔ یہی ملکہ اسے اس حد تک کہ وہ ان گناہوں سے دور رہے ، عصمت بخشتا ہے ۔ بنابراین گناہوں سے عصمت کا تعلق انسان کے درجۂ ایمان سے ہے کہ وہ فلاں گناہ کو گناہ اور فلاں خطرہ کو خطرہ سمجھتا ہے یا نہیں ۔ ہم نے گناہوں کو تعبداً قبول کیا ہے یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اسلام نے کہا ہے کہ شراب نہ پیو اس لئے ہم نہیں پیتے ، کہا ہے کہ جوا نہ کھیلو ، ہم نہیں کھیلتے ۔ ہم کم و بیش جانتے بھی ہیں کہ یہ کام برے ہیں ، لیکن جس قدر خود کو آگ کے حوالے کر دینے کا خطرہ یا گناہ ہم پر روشن و واضح ہے اس قدر ان گناہوں کے خطرات ہم پر واضح نہیں ہیں ۔ ہم جتنا اس خطرہ سے متعلق یقین رکھتے ہیں اگر اتنا ہی ان خطرات اور گناہوں پر یقین و ایمان رکھتے تو ہم بھی ان گناہوں سے معصوم ہوتے ۔ پس گناہوں سے عصمت کا مطلب ہے منتہیٰ و کمالِ ایمان ۔ لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے "لَوْ كُشِفَ الغِطَاءُ لَمَا ازْدَدْتُ يَقِينِي" (۱) اگر پردے اُٹھ جائیں پھر بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا " وہ قطعی طور پر گناہوں سے معصوم ہے ۔ وہ پردے کے اس سمت سے بھی پس پردہ کی چیزوں کو مجسّم دیکھتا ہے ۔ یعنی مثال کے طور پر وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک بُری بات منہ سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حقیقتاً اپنی جان کے لئے ایک بچھو پیدا کر لیا ہے اسی بنا پر وہ ایسے کام نہیں کرتا ، اور بلا شبہ قرآن بھی اس پایہ کے ایمان کا تذکرہ فرماتا ہے ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عصمت نسبی ہے یعنی اس کے مراتب و درجات ہیں ۔

---

۱ ۔ سفینۃ البحار ج ۲ ص ۷۳۴ (از حضرت علی علیہ السلام)

معصومین ان چیزوں میں ـــــ جو ہمارے لئے گناہ ہے اور کبھی ہم ان کے مرتکب ہوتے ہیں اور کبھی ان سے پرہیز کرتے ہیں ـــــ معصوم ہیں اور ہرگز گناہ نہیں کرتے۔ لیکن تمام معصومین ایک جیسے نہیں ہیں۔ عصمت کو بھی مراحل و مراتب ہیں۔ عصمت کے بعض مراحل میں وہ ہمارے جیسے ہیں یعنی جس طرح ہم گناہوں سے معصوم نہیں ہیں، وہ حضرات بھی (عصمت کے ان مراحل و مراتب میں) معصوم نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو ہم گناہ شمار کرتے ہیں ان میں وہ صد فی صد معصوم ہیں لیکن ایسی چیزیں بھی ان کے لئے گناہ ہیں جو ہمارے لئے حسنہ اور نیکیاں ہیں، کیونکہ ہم (اس درجہ تک) نہیں پہنچے ہیں۔ مثال کے طور پر درجہ پانچ کا طالب علم چھٹے درجہ کا کوئی سوال حل کردے تو یہ اس کے لئے باعث شرف و فضیلت اور انعام کے لائق بات ہے، لیکن اگر اسی سوال کو نویں درجہ کا طالب علم حل کرے تو یہ اس کے لئے کچھ اہمیت کی بات نہ ہوگی۔ اسی طرح سمجھیں کہ کچھ چیزیں ہمارے لئے تو حسنات ہیں لیکن ان کے لئے گناہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود ان کی طرف عصیان کی نسبت دیتا ہے (وَعَصٰیٓ اٰدَمُ رَبَّہٗ) (۱) (آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی) یا پیغمبر اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ" (۲)

تاکہ خداوند عالم آپ کے پچھلے اور اگلے گناہوں کو بخش دے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت ایک نسبی امر ہے۔ گویا وہ اپنی حد میں اور ہم اپنی حد میں۔ پس عصمت کی اصل و ماہیت گناہ سے ایمان کے درجہ اور کمال ایمان کی طرف پلٹتی ہے۔ انسان ایمان کے کسی بھی درجہ میں ہو لیکن جس موضوع سے متعلق وہ کامل ایمان رکھتا ہے۔ یعنی:

"وَلَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّہٖ" کے درجہ پر فائز ہے اور دلیل پروردگار

۱۔ سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۱ ۲۔ سورہ فتح آیت ۲

کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس میں وہ لامحالہ معصوم ہے۔ نہ کہ خود معصوم بھی ہماری ہی طرح ہے کہ وہ گناہ و معصیت کی طرف قدم بڑھانا چاہتا ہے لیکن اللہ کی طرف سے مامور کوئی فرشتہ اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے اور اسے روک دیتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھ میں اور امیر المومنینؑ میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ میں بھی گناہ کی طرف مائل ہوتا ہوں اور (معاذ اللہ) وہ بھی مائل ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان پر ایک ملک معین ہے جو انھیں اس کام سے روکتا ہے اور ہم پر اس طرح کا کوئی مامور نہیں ہے۔ اگر انسان کو گناہ سے روکنے کے لئے کوئی خارجی مامور بھی موجود ہو تو یہ کوئی کمال کی بات نہ ہوئی۔ اس کی مثال یوں ہی ہے کہ ایک شخص چوری کرتا ہے اور میں چوری نہیں کرتا، لیکن میں جو چوری نہیں کرتا اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے اعمال کا نگراں ایک شخص ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس صورت میں، میں بھی اسی کی طرح چور ہوں فرق یہ ہے کہ کوئی نگراں اسے اس کام سے نہیں روکتا اور میرے حرکات و سکنات کا نگراں میری راہ میں حائل ہے۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہوئی۔

مسئلۂ عصمت میں اہم اور کلی مسئلہ گناہ سے معصوم ہونے کا مسئلہ ہے۔ خطا سے معصوم ہونا ایک دوسرا مسئلہ ہے اور اس کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک احکام کی تبلیغ میں خطا کا مسئلہ ہے مثلاً ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے ہمارے لئے احکام بیان فرمائے ہیں لیکن شاید اس میں خطا یا اشتباہ سے کام لیا ہے۔ شاید خداوند عالم نے ان پر وحی کسی اور شکل میں نازل فرمائی تھی لیکن آنحضرتؐ نے اشتباہاً اسے دوسری طرح سے بیان فرمایا۔ بالکل یوں ہی جیسے ہم خطا کرتے ہیں، یعنی ہم سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ یہ پیغام پہنچا دو اور ہم جا کر اس کا الٹا پیغام بیان کر دیتے ہیں۔ یعنی اس امکان پر کہ ممکن ہے پیغمبرؐ نے تبلیغ احکام میں خطا یا اشتباہ سے کام لیا ہو، سرے سے پیغمبر اسلامؐ کی باتوں پر اعتماد ہی نہ ہو، قطعی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اب رہی تمام مسائل میں معصوم سے خطا کی بات تو یہاں انجینیر صاحب نے اپنی سرعت فیصلہ کا ثبوت دیتے ہوئے امیر المومنینؑ پر ظلم کیا ہے اور واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

آپ نے کیسے تیزی کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیا کہ اگر آپ امیر المومنین ؑ کی جگہ پر ہوتے تو عبداللہ ابن عباس کا انتخاب نہ کرتے۔ اور . . . . ؟ اسی طرح کے تاریخی مسائل میں ظنی وگمانی فیصلوں کے اظہار میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ مثلاً انسان کسی شخص کے بارے میں اظہار خیال کرے کہ میں سوچتا ہوں اگر فلاں شخص پانچ سو سال پہلے اُس کام کے بجائے یہ کام کرتا تو بہتر تھا، اور کوئی اس سے یہ کہے کہ کیا قطعی ایسا ہے؟ تو وہ جواب دے کہ میرا ہی خیال ہے! تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ لیکن ان مسائل میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا امیر المؤمنین ؑ ہی کی نسبت نہیں؟ دوسرے افراد کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے۔

حضرت ؑ ان واقعات ومسائل میں خود حاضر وناظر تھے اور عبداللہ ابن عباس کو ہم اور آپ سے بہتر جانتے تھے، یوں ہی اپنے دوسرے اصحاب کو بھی ہم سے اور آپ سے زیادہ بہتر طور پر پہچانتے تھے۔ اور ہم اپنی جگہ بیٹھ کر قضاوت کریں کہ اگر حضرت علی ؑ عبداللہ بن عباس کی جگہ پر کسی دوسرے کو منتخب فرماتے تو وہ اس کام کو بہتر طور پر انجام دیتا۔ یہ دراصل اس طرح کے مسائل میں عجولانہ قضاوت کی نشانی ہے۔ مزید یہ کہ آپ نے خود خود اپنے بیانات میں جن سے ہم ہمیشہ استفادہ کرتے رہے ہیں، برابر یہ بات ذکر کی ہے کہ علی ؑ ایک مخصوص سیاست پر گامزن تھے اور نہ وہ خود چاہتے تھے نہ ان کے لئے سزاوار ہی تھا کہ ذرہ برابر بھی اس سیاست سے الگ ہوتے اور یہ وہ راہ سیاست تھی جس میں ان کے پاس ناصر ومددگار نہیں تھے۔ حضرت ؑ خود بھی ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ افسوس میرے پاس افراد نہیں ہیں۔ یہی عبداللہ بن عباس اور دوسرے افراد حضرت علی ؑ کی خدمت میں آتے تھے اور ان سے اپنی روش میں لوچ اور نرمی پیدا کرنے کی درخواست کرتے تھے یعنی وہی طرز عمل اپنانے کو کہتے تھے " جسے آج کی دنیا میں سیاست کہتے ہیں۔ آپ کم از کم یہی ثابت کیجیے کہ حضرت علی ؑ کے پاس ان کے ہم فکر وہم نوا کافی افراد موجود تھے اور آپ ؑ نے ان کے درمیان اشخاص کے انتخاب میں اشتباہ سے کام لیا۔ میں تو ثابت نہیں کرسکتا کہ حضرت کے پاس حسب ضرورت افراد موجود رہے ہوں۔ میں بس اسی قدر جانتا ہوں کہ علی ؑ جنہیں پیغمبر ؐ نے خلافت کے لئے معین فرمایا تھا۔ جب لوگوں نے خلافت پر

قبضہ کرلیا تو اس قدر احتجاج اور شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ لوگوں نے میرا حق مجھ سے چھین لیا۔ لیکن عثمان کے بعد جب لوگ آپ کی بیعت کے لئے آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ خود کو اس امر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

" دَعُونِي وَالتَمِسُوا غَيْرِي فَإِنَّا مُسْتَقْبِلُونَ أَمْراً لَهُ وُجُوهٌ وَأَلْوَانٌ ... وَإِنَّ الآفَاقَ قَدْ أَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ (۱)

مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لئے) کسی دوسرے کو ڈھونڈ لو، بلاشبہ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں، جسے نہ دل برداشت کرسکتے ہیں اور نہ عقلیں مان سکتی ہیں۔ فضائیں تاریک ہوچکی ہیں اور راستہ پہچانتے میں نہیں آتا"

مفہوم یہ ہے کہ حالات اب خراب ہوچکے ہیں، اب کام نہیں کیا جاسکتا یعنی میرے پاس افراد نہیں ہیں، میرے رفقا تمام ہو گئے اب میرے کام کے آدمی نہیں رہے (جن کی مدد سے میں معاشرہ کی) اصلاح کرسکوں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ...

اب مجھ پر حجت تمام ہو گئی۔ میں تاریخ کے روبرو کوئی عذر نہیں رکھتا تاریخ میری یہ بات نہیں مانے گی۔ کہا یہی جائے گا کہ علیؑ نے موقع ہاتھ سے کھو دیا، اس کے باوجود کہ یہ موقع میرے لئے کوئی موقع نہیں ہے— لیکن تاریخ کا منہ بند کرنے کے لئے کہ یہ نہ کہا جائے کہ بہترین موقع تھا جسے علیؑ نے کھو دیا— اس منصب کو قبول کرتا ہوں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے خود اس کا اظہار فرمایا کہ میرے پاس آدمی نہیں ہیں اور یہ میری خلافت کا موقع نہیں ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام۔ خطبہ ۹۱

انسان ہر شخص کے سلسلہ میں شک و تردید کا شکار ہو سکتا ہے لیکن خود حضرت علیؑ کے لئے تاریخ کو بھی اس بات میں شک نہیں ہے کہ آپ خود کو دوسروں کی بہ نسبت خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے اور اہل سنت بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ علیؑ خلافت کے لئے خود کو ابو بکر و عمر وغیرہ ۔۔۔۔ سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔

پھر یہ کیا ہوا کہ جو علیؑ اپنے آپ کو ابو بکر و عمر سے خلافت کا زیادہ حقدار سمجھے، جب لوگ عثمان کے بعد خلافت کے لئے اس کے پاس جائیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہوا نظر آئے اور یہ کہے کہ:-

تمہارا امیر بننے سے بہتر ہے کہ میں اس کے بعد بھی تمہارا مشیر ہی بن کر رہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کے پاس ایسے افراد نہیں تھے۔ اب اس کے اسباب و علل کیا تھے، یہ ایک دوسری بحث ہے۔

اب رہا: "وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ" کا مسئلہ تو اول یہ جو انہوں نے فرمایا کہ زکات انگوٹھی پر نہیں ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ کلی طور پر کارِ خیر کے لئے ہر طرح کے انفاق کو زکات کہتے ہیں۔ آج کل جو فقہا کی عرف میں زکات کی اصطلاح رائج ہے اس سے مراد زکات واجب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی "يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ" آیا ہو اس سے مراد یہی زکوٰۃ واجب ہے۔ زکات کا مطلب ہے مال کا پاک و صاف کرنا۔ حتیٰ کہ اس سے مراد روح اور نفس کا پاک کرنا بھی ہے۔ قرآن کلی طور پر مالی خیرات کو مال کی زکات یا روح و نفس کی زکات کہتا ہے۔ چنانچہ لفظ صدقہ کا مفہوم بھی اسی قدر وسعت رکھتا ہے آج صدقہ کا ایک خاص مفہوم ہے مثلاً کہتے ہیں صدقہ سرّی (چھپا کر صدقہ دینا) لیکن قرآن ہر کار خیر کو صدقہ کہتا ہے۔ اگر آپ ایک اسپتال تعمیر کریں یا کوئی کتاب لکھیں جس کا فائدہ عام طور سے لوگوں کو پہنچتا ہو۔ قرآن کی نظر میں وہ صدقہ ہے "صدقہ جاریة" ایک جاری صدقہ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت نے بھی جب مذکورہ آیت سے اخذ شدہ مفہوم پر اعتراض کرنا چاہا ہے تو اس لفظ پر ایسا کوئی اعتراض

نہیں کیا ہے کہ زکات انگوٹھی سے متعلق نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ ادبیات عرب سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ لفظ زکات، زکات واجب سے مخصوص نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ عمل حالتِ رکوع میں کیوں اور کیسے انجام پایا؟ یہ اعتراض فخرالدین رازی جیسے قدیم مفسرین نے بھی اٹھایا ہے کہ علیؑ ہمیشہ حالت نماز میں اس قدر کھو جاتے تھے کہ انہیں اردگرد کا احساس بھی نہ رہتا تھا۔ پھر آپؑ یہ کیسے کہتے ہیں کہ نماز کی حالت میں یہ عمل انجام پایا؟ جواب یہ ہے کہ

اول تو: علیؑ کا نماز کی حالت میں اپنے آپ سے بے خبر ہو جانا ایک حقیقت ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اولیائے خدا کے تمام حالات و کیفیات ہمیشہ ایک ہی جیسے رہے ہیں۔ خود پیغمبر اکرمؐ کے لئے دونوں کیفیتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کبھی نماز کی حالت میں آپؐ پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ اذان کے تمام ہونے کی تاب بھی نہ رہتی تھی فرماتے تھے: "اَرِحْنَا یَا بِلَالُ" اے بلال جلد اذان ختم کرو کہ ہم نماز شروع کریں اور کبھی نماز کی حالت میں ہوتے تھے، سجدہ کے لئے سر مبارک کو خاک پر رکھتے تھے اور آپ کے نواسے امام حسنؑ یا امام حسینؑ آکر آپ کی پشت مبارک پر سوار ہو جاتے تھے اور آپؐ پورے اطمینان کے ساتھ یوں ہی ٹھہرے رہتے تھے کہ یہ بچہ کہیں گر نہ پڑے اور جب تک نواسہ اتر نہ آتا تھا سجدہ کو طول دیتے تھے۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ نماز میں قیام کی حالت میں تھے۔ نماز کی جگہ پر سامنے گویا کسی نے تھوک دیا تھا۔ پیغمبرؐ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پاؤں سے اسے مٹی میں چھپا دیا اس کے بعد اپنی جگہ واپس پلٹ آئے۔ فقہا نے اس واقعہ کی روشنی میں نماز سے متعلق بہت سے مسائل اخذ کئے ہیں۔ سید بحرالعلوم فرماتے ہیں:-

وَمَشْیُ خَیْرِ الْخَلْقِ فِی الْمِحْرَابِ

یُفْتَحُ مِنْہُ اَکْثَرُ الْاَبْوَابِ

مطلب یہ ہے کہ نماز کی حالت میں پیغمبر اسلامؐ دو قدم آگے بڑھے، وہ عمل انجام

دیا اور واپس پلٹ آئے اس عمل نے ان بہت سے مسائل کو حل کر دیا کہ نماز کی حالت میں کس حد تک اضافی عمل جائز ہے یا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتوں کا حل مل گیا۔ چنانچہ ان حضرات کے حالات و کیفیات مختلف رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا مطلب جو عرفانی ہے یہ ہے کہ وہ افراد جو عرفانی مذاق رکھتے ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ اگر استغراق و انجذاب کی کیفیت اپنے کمال پر ہو تو اس میں "برگشت" کی حالت پائی جاتی ہے یعنی اس صورت میں انسان خدا کی ذات میں مستغرق ہونے کے ساتھ ہی ماسوائے اللہ میں بھی مشغول رہتا ہے۔ یہ اہل عرفان کا خیال ہے اور میں بھی اُسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس جلسہ میں شاید بہت زیادہ قابل قبول نہ ہو کہ میں اسے عرض ہی کر دوں۔ یہ خلع بدنی کے مسئلہ کی مانند ہے۔ جو افراد اس مرحلہ میں تازہ وارد ہوتے ہیں ایک لمحہ یا دو لمحہ ایک گھنٹہ تک اپنے آپ سے بے خبر یا اپنے جسم سے الگ ہو جاتے ہیں۔ بعض افراد ہر حال میں اپنے جسم سے الگ یا خود سے بے خبر رہتے ہیں۔ (البتہ میں اس کا معتقد ہی نہیں بلکہ عینی گواہ بھی ہوں) مثال کے طور اس وقت ہمارے اور آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں اپنے جسم سے دور الگ اور لا تعلق ہیں۔

اہل عرفان کی نظر میں یہ حالت و کیفیت کہ نماز کے دوران پاؤں سے تیر نکال لیا جائے اور انسان متوجہ نہ ہو، اس حالت و کیفیت سے ناقص تر ہے جس میں انسان نماز کے دوران فقیر و سائل کی طرف بھی متوجہ ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں وہ خدا سے غافل ہے اور فقیر کی طرف متوجہ ہے بلکہ اس کی توجہ خدا کی طرف اس قدر کامل ہے کہ اس حالت میں وہ تمام عالم کو اپنے سامنے موجود پاتا ہے۔ لہٰذا ان تمام قرائن کی موجودگی میں ان حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

امامت کے کلی مسائل سے متعلق یہ ہماری آخری بحث ہے اس کے بعد ہم اس سلسلہ میں جو بحثیں کریں گے وہ احادیث و روایات کی روشنی میں ہوں گی۔ مثال کے طور پر وہ حدیثیں جو امیر المومنینؑ کے سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں یا خود امیر المومنینؑ نے اپنے بعد کے ائمہؑ کے لئے ذکر فرمائی ہیں، یوں ہی حضرت رسول خدا نے ان ائمہ کے بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے نیز یہ کہ ہر امام نے اپنے بعد کے امام کے لئے کس طرح وضاحت فرمائی ہے ہم ایک ایک کر کے ان سب کا جائزہ لیں گے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر روایات نقلی، تعیینی و تنصیصی پہلو رکھتی ہیں۔

موجودہ بحث کچھ اس ڈھنگ کی ہے کہ اس کا کچھ حصہ شاید ہم گزشتہ گفتگو میں بھی متفرق طور پر پیش کر چکے ہیں لیکن چونکہ یہ مسئلہ امامت کی روح سے مربوط ہے لہٰذا اب ہم ائمہ معصومینؑ کے اقوال کی روشنی میں اس پر بحث کریں گے۔ اور کتاب "اصول کافی" کی کتاب الحجۃ" کا ایک حصہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔ ہم مکرر عرض کر چکے ہیں کہ امامت کا جو مفہوم ہم شیعہ یا کم از کم ائمہؑ شیعہ کے اقوال میں پیش کیا گیا ہے وہ امامت کے اس مفہوم سے بالکل الگ ہے جو اہل سنت کے یہاں رائج ہے۔ یہ مسئلہ حکومت سے بالکل الگ ایک چیز ہے جس کا چرچا ہمارے زمانہ میں بہت ہوتا ہے۔ مثلاً، امامت بنیادی طور پر نبوت کے قدم بہ قدم یا اس کے بالکل

چھٹی بحث

امامت ائمۂ اطہارؑ کی نگاہ میں

دوش بدوش والا مسئلہ ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ اس کا مرتبہ ہر نبوت سے کمتر درجہ کا ہے۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ نبوت سے مشابہ ایک ایسا منصب ہے جو بڑے انبیاء کو بھی عطا ہوا ہے یعنی یہ ایک ایسا معنوی منصب ہے کہ بڑے انبیاء نبوت کے ساتھ ساتھ امامت کے منصب پر بھی فائز رہے ہیں۔ ائمۂ معصومینؑ نے کلی طور پر اس مسئلہ کے تحت اپنی گفتگو میں انسان کو بنیاد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں پہلے انسان کے متعلق اپنے تصورات وخیالات پر تجدید نظر کرنا چاہیئے تاکہ یہ مسئلہ پورے طور سے واضح ہو سکے۔

انسان ؟

آپ جانتے ہیں کہ اساسی طور پر انسان کے سلسلہ میں دو نظریے پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ انسان بھی تمام جانداروں کے مانند صد فی صد ایک خاکی یا مادی وجود ہے۔ لیکن یہ ایسا مادی وجود ہے جو اپنے تغیرات کی راہ طے کرتے ہوئے اس حد کمال کو پہنچ چکا ہے جہاں تک زیادہ سے زیادہ مادہ میں اس کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ حیات، چاہے نباتات میں ہو یا اس سے بلند حیوانات میں یا ان سب سے بڑھ کر انسان میں، یہ خود مادہ کے تدریجی ارتقاو کمال کی نشاندہی کرتی ہے۔ یعنی اس وجود کی بناوٹ اور ساخت میں مادی عناصر کے علاوہ کوئی اور عنصر کارفرما نہیں ہے۔ (یہاں عنصر کا لفظ اس لئے استعمال ہوا کہ اس کی کوئی دوسری تعبیر ہمارے پاس نہیں ہے)۔ جتنے حیرت انگیز آثار اس وجود میں پائے جاتے ہیں ان کا سرچشمہ یہی مادی تشکیل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق قہری طور پر پہلے انسان کو یا دنیا میں آنے والے ابتدائی انسانوں کو ناقص ترین انسان ہونا چاہیئے اور جوں جوں یہ قافلہ انسانیت آگے بڑھا ہوگا انسان کامل تر ہوتا گیا ہوگا خواہ ہم اولین انسان کو قدما کے تصور کے مطابق براہ راست خاک سے پیدا شدہ مانیں یا عہد حاضر کے بعض (سائنس داں) حضرات کے مفروضہ کے مطابق ــــ جو مفروضہ ہونے کی حیثیت سے قابل توجہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے پست تر اور ناقص تر وجود[1] کی تغیر یافتہ اور کامل شدہ مخلوق ہے۔ جس کی

۱۔ ڈارون کا مشہور نظریہ۔ انسان پہلے بندر تھا . . . . (مترجم)

اصل و بنیاد مٹی تک پہنچتی ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلا انسان براہ راست خاک سے خلق ہو گیا ہو۔

پہلا انسان قرآن کی نظر میں

لیکن اسلامی و قرآنی بلکہ تمام مذاہب کے اعتقادات کے مطابق پہلا انسان وہ وجود ہے جو اپنے بعد کے بہت سے انسانوں حتی کہ آج کے انسانوں سے بھی زیادہ کامل ہے ۔ یعنی پہلی بار جب اس انسان نے عرصۂ عالم میں قدم رکھا ، اسی وقت سے وہ خلیفۃ اللہ یا دوسرے الفاظ میں پیغمبر کے درجہ پر فائز نظر آیا۔ دین کی منطق میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ کیوں پہلا انسان ہی دنیا میں آیا تو ایک حجت خدا اور پیغمبر کی شکل میں آیا ، جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ انسان دنیا میں آتے رہتے اور ارتقائی منازل طے کرتے رہتے اور جب عالی مراحل و مراتب سے ہمکنار ہوتے تو ان میں سے کوئی ایک نبوت و پیغمبری کے منصب پر فائز ہو جاتا ، نہ یہ کہ پہلا ہی انسان پیغمبر ہو۔

قرآن کریم پہلے انسان کے لئے بہت عظیم اور بلند درجہ کا قائل ہے :

" وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ " (۱)

"جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا (خدایا) کیا تو انھیں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد و خونریزی برپا کریں اور ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں (خداوند عالم نے فرمایا ، بلاشبہ (اس انسان کے اسرار کے بارے میں) جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور اللہ نے آدمؑ کو تمام اسماء تعلیم دیئے پھر ان کے حقائق ملائکہ کے سامنے بھی پیش

۱۔ سورہ بقرہ ۔ آیات ۳۰ ۔ ۳۱ ۔

کئے اور فرمایا ہمیں ان کے نام بتاؤ"۔

مختصر یہ کہ جب پہلا انسان عالم وجود میں آیا تو اس نے ملائکہ کو بھی حیرت میں ڈال دیا کہ آخر اس میں کیا راز پنہاں ہے؟ ـــــ پہلے انسان کے بارے میں "نفخت فیه من روحی" (اپنی روح اس میں پھونکی) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پیکر کی ساخت اور اس کے ڈھانچہ میں مادی عناصر کے علاوہ ایک عُلوی عنصر بھی کارفرما ہے جو (اپنی روح) کی تعبیر کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے ایک خصوصی شئے اس وجود کے پیکر میں داخل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اس لئے بھی کہ اس کو خلیفۃ اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" میں زمین پر اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں۔

بنا برایں قرآن، انسان کو اس عظمت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کہ پہلا انسان جب عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو حجت خدا و پیغمبر خدا اور ایک ایسے وجود کے عنوان سے قدم رکھتا ہے جو عالم غیب سے رابطہ رکھتا ہو۔ ہمارے ائمہؑ کے کلام کی اساس و بنیاد انسان کی اسی اصل وحقیقت پر ہے یعنی پہلا انسان جو اس زمین پر آیا اسی صنف کا تھا اور آخری انسان بھی جو اس زمین پر ہوگا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہوگا اور عالم انسانیت کبھی بھی ایسے وجود سے خالی نہیں جس میں "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" کی روح پائی جاتی ہے۔ (بنیادی طور سے اس مسئلہ کا محور یہی ہے) دیگر تمام انسان، ایسے انسانی وجود کی فرع کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اگر یہ انسان نہ ہو تو بقیہ تمام انسان کسی بھی صورت سے باقی نہیں رہیں گے۔ ایسے ہی انسان کو حجت خدا سے تعبیر کرتے ہیں:۔

"اَللّٰھُمَّ بَلٰی لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰہِ بِحُجَّۃٍ" ہاں (مگر) زمین ایسی فرد سے خالی نہیں رہتی جو اللہ کی حجت ہے یہ جملہ نہج البلاغہ[1] میں ہے اور بہت سی کتابوں میں نقل ہوا ہے۔ میں نے یہ بات مرحوم آیۃ اللہ بروجردی سے سنی ہے، لیکن یہ یاد نہیں کہ میں نے خود اسے دوسری جگہ بھی کہیں دیکھا ہے یا نہیں، یعنی اس کی جستجو نہیں کی۔ آپ فرماتے تھے کہ

۱۔ نہج البلاغہ، فیض الاسلام، حکمت نمبر ۱۳۹ ـــ مطابق نہج البلاغہ مترجم مفتی جعفر حسین مرحوم، حکمت ۱۴۷

یہ جملہ حضرتؑ کے ان جملوں میں سے ہے جنھیں آپ نے بصرہ میں بیان فرمایا ہے اور شیعہ وسنی دونوں نے اسے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ جملہ مشہور حدیث کمیل کا ایک حصہ ہے۔ کمیل کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت علیؑ نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اپنے ہمراہ لے کر شہر کے باہر تشریف لائے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ "جبان" نامی ایک جگہ پر پہنچے۔ جیسے ہی ہم لوگ شہر سے خارج ہو کر سناٹے اور تنہائی میں آئے: فَتَنَفَّسَ الصُّعَدَاءَ حضرتؑ نے گہری سانس لی، ایک آہ کھینچی اور فرمایا:-

"یا کمیل! اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوبَ اَوْعِیَةٌ فَخَیْرُهَا اَوْعَاهَا فَاحْفَظْ عَنِّی مَا اَقُولُ لَكَ"

"اے کمیل! اولاد آدمؑ کے دل ظرف کے مانند ہیں اور بہترین ظرف وہ ہے جو کسی چیز کو اپنے اندر محفوظ رکھے (یعنی اس میں سوراخ نہ ہو) لہٰذا میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اسے محفوظ کرلو"۔

پہلے آپ نے انسانوں کو تین گروہوں میں تقسیم فرمایا:-

"اَلنَّاسُ ثَلَاثَةٌ: فَعَالِمٌ رَبَّانِیٌّ وَمُتَعَلِّمٌ عَلٰی سَبِیلِ نَجَاةٍ وَهَمَجٌ رَعَاعٌ"۔

"انسان تین قسم کے ہیں: ایک گروہ علمائے ربانی کا ہے (البتہ حضرت علیؑ کی اصطلاح میں عالم ربانی سے مراد ہر وہ عالم ربانی نہیں ہے جو ہم ہر ایک کو تکلفاً کہہ دیا کرتے ہیں، بلکہ اس سے مراد ایسا عالم ہے جو واقعاً صدفی صد الٰہی ہو اور خالص خدا کے لئے عمل کرتا ہو اور شاید یہ تعبیر سوائے انبیاءؑ وائمہؑ کے کسی اور پر صادق نہیں آتی) "وَمُتَعَلِّمٌ عَلٰی سَبِیلِ نَجَاةٍ" (چونکہ اس عالم کو اس متعلم کے مقابل میں ذکر کیا ہے لہٰذا اُس سے مقصود وہ عالم ہے جو کسی بشر سے علم حاصل نہیں کرتا) یہ دوسرا گروہ اُن سے علم حاصل کرنے والوں اور شاگردوں کا ہے۔ ان لوگوں کا ہے جو ان علماء سے استفادہ کرتے ہیں۔ تیسرے گروہ کے لوگ "همج رعاع" ہیں (اس کی تشریح یہ ہے) کہ: "لَمْ یَسْتَضِیئُوا بِنُورِ الْعِلْمِ وَلَمْ یَلْجَأُوا اِلٰی رُكْنٍ وَثِیقٍ"، جنھوں نے علم کے نور سے نہ کوئی روشنی حاصل کی ہے اور نہ کسی محکم

ستون کا سہارا حاصل کیا ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اہل زمانہ کا گلہ کرنا شروع کیا۔ فرمایا میں بہت سے علوم اپنے سینہ میں رکھتا ہوں۔ لیکن مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس میں (انھیں حاصل کرنے کی) صلاحیت موجود ہو۔ آپؑ نے لوگوں کی گروہ بندی کرتے ہوئے فرمایا، ایسے لوگ بھی ہیں جو زیرک اور عقلمند ہیں لیکن ایسے زیرک ہیں کہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں) اس سے اپنے لئے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی دین کو اپنی دنیا کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا میں ان سے پرہیز کرنے پر مجبور ہوں۔ کچھ دوسرے افراد ہیں جو اچھے اور نیک تو ہیں لیکن احمق ہیں۔ وہ کچھ حاصل ہی نہیں کرتے یا اگر حاصل بھی کرتے ہیں تو ایک دم الٹا اور غلط مطلب سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک تو امامؑ کی گفتگو مایوسانہ رنگ لئے ہوئے ہے (کیونکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے) کہ کوئی اہل موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں: "اَللّٰھُمَّ بَلٰی......" نہیں ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی شخص موجود نہ ہو۔ میں تو یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں لوگوں کی اکثریت کو کہہ رہا ہوں (یہاں آقائے بروجردی فرماتے تھے کہ حضرتؑ نے یہ اشارہ بصرہ میں ایک خطبہ کے ذیل میں فرمایا تھا، ورنہ یہ کمیل کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں بھی موجود ہے)۔

اَللّٰھُمَّ بَلٰی لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰہِ بِحُجَّۃٍ اِمَّا ظَاھِرًا مَشْھُوْرًا وَ اِمَّا خَائِفًا مَغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰہِ وَ بَیِّنَاتُہٗ وَ کَمْ ذَا وَ اَیْنَ؟ اُولٰئِکَ وَاللّٰہِ۔ الْاَقَلُّوْنَ عَدَدًا وَ الْاَعْظَمُوْنَ عِنْدَ اللّٰہِ قَدْرًا، یَحْفَظُ اللّٰہُ بِھِمْ حُجَجَہٗ وَ بَیِّنَاتِہٖ حَتّٰی یُوْدِعُوْھَا نُظَرَائَھُمْ وَ یَزْرَعُوْھَا فِیْ قُلُوْبِ اَشْبَاھِھِمْ ھَجَمَ بِھِمُ الْعِلْمُ عَلٰی حَقِیْقَۃِ الْبَصِیْرَۃِ وَ بَاشَرُوْا رُوْحَ الْیَقِیْنِ وَاسْتَلَانُوْا مَا اسْتَعْوَرَہُ الْمُتْرَفُوْنَ وَ اَنِسُوْا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْہُ الْجَاھِلُوْنَ وَ صَحِبُوا الدُّنْیَا بِاَبْدَانٍ اَرْوَاحُھَا مُعَلَّقَۃٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰی۔

(نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت ۱۳۹ مطابق نہج البلاغہ مترجم مفتی جعفر حسین مرحوم حکمت نمبر ۱۴۷)

امام علیہ السلام نے فرمایا : ہاں ، زمین ہرگز حجت خدا سے خالی نہیں ہے ۔ اب چاہے یہ حجت ظاہر ہو اور لوگوں کے درمیان ہو یا مستور اور پوشیدہ یعنی موجود تو ہو ، لیکن لوگ اسے دیکھ نہ پائیں ، وہ نگاہ سے پوشیدہ ہو ۔ ان ہی حجتوں کے ذریعہ خداوند عالم اپنی دلیلیں اور نشانیاں لوگوں کے درمیان محفوظ رکھتا ہے ۔ اور یہ لوگ بھی جو کچھ جانتے ہیں اس کے بیج اپنے ہی جیسے افراد کے دلوں میں بو دیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ امانتیں ان کے حوالہ نہ کریں اور چلے جائیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے اسے بیان کئے بغیر چلا جاؤں گا ۔ اس کے بعد حضرت ان افراد سے متعلق جو ایک ملکوتی مبدأ و مرکز سے استفادہ کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں : **هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلٰى حَقِيْقَةِ الْبَصِيْرَةِ** خود علم ان پر ہجوم کرتا ہے اور ٹوٹ کر برستا ہے ۔ وہ علم کی طرف نہیں بڑھتے ۔ (مطلب یہ ہے کہ ان کا علم تفویضی ہے) اور وہ علم جو ان پر ہجوم کرتا ہے ، انھیں حقیقی معنوں میں بصیرت عطا کرتا ہے یعنی اس علم میں کوئی اشتباہ ، نقص یا خطا نہیں پائی جاتی ۔ "**وَبَاشَرُوْا رُوْحَ الْيَقِيْنِ**" وہ روح یقین کو متصل رکھتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ عالم دیگر سے بھی ایک طرح کا ارتباط و اتصال رکھتے ہیں ۔ ـــــ "**وَاسْتَلَانُوْا مَا اسْتَعْوَرَهُ الْمُتْرَفُوْنَ**" وہ چیزیں جنھیں مترف (یعنی اہل عیش و طرب) اپنے لئے بہت دشوار سمجھتے ہیں ان کے لئے آسان ہیں ۔ مثلاً عیش و عشرت کے عادی افراد کا گھنٹہ بھر اپنے خدا سے لو لگانا اور اس سے راز و نیاز کی باتیں کرنا گویا سب سے زیادہ دشوار کام ہے ۔ لیکن ان کے لئے یہ کام آسان ہی نہیں بلکہ ان کا پسندیدہ عمل ہے ۔ "**وَاَنِسُوْا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُوْنَ**" جن چیزوں سے نادان اور جاہل افراد وحشت کرتے ہیں یہ ان سے مانوس ہیں ۔

"**وَصَحِبُوا الدُّنْيَا بِاَبْدَانٍ اَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَحَلِّ الْاَعْلٰى**" وہ اپنے جسموں کے ساتھ لوگوں کے ہمراہ رہتے ہیں جبکہ اسی وقت ان کی روحیں مقام اعلیٰ سے تعلق و اتصال رکھتی ہیں ۔ یعنی ان کا جسم لوگوں کے ساتھ ہے لیکن ان کی

روح یہاں نہیں ہے۔ جو لوگ ان کے ہمراہ ہیں انھیں اپنے ہی جیسا انسان سمجھتے ہیں اور ان میں اور اپنے آپ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس (انسانِ کامل) کا باطن کسی اور عالم سے وابستہ ہے۔

بہر حال امامت کا اصل فلسفہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب "کافی" میں "باب الحجۃ" کے عنوان سے ایک مستقل باب موجود ہے۔ اور اس میں ملتا ہے کہ اگر دنیا میں صرف دو انسان باقی رہیں تو ان میں کا ایک اسی طرح کا انسان ہوگا جس طرح دنیا کا پہلا انسان اسی منصب پر فائز تھا ہم اس فلسفہ کی روح کو لوگوں کے ذہنوں سے مزید قریب کرنے کے لئے اور اس حقیقت سے زیادہ آشنا کرنے کے لئے "اصول کافی" سے "کتاب الحجۃ" کی بعض روایتیں اور حدیثیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس مسئلہ سے متعلق تمام دوسرے مسائل مثلاً معاشرہ میں امام کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ لوگوں پر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرے۔ یا دینی امور میں لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو حل کر سکے۔ یہ سب باتیں اس اصل مسئلہ میں طفیلی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امام کو لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے امام قرار دیا جائے اور بس، بلکہ یہ مسئلہ ان تمام باتوں سے کہیں بالاتر ہے۔ یہ باتیں گویا امام کے "فوائد جاریہ" یعنی اس کے وجود کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے فوائد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم ہر حدیث سے کچھ جملے منتخب کر کے آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں تاکہ فلسفۂ امامت کی حقیقت پورے طور سے واضح ہو جائے۔

امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت (۴)

یہ روایت انبیاء و مرسلین سے متعلق ہے۔ ایک زندیق (مادہ پرست) نے امام صادقؑ سے سوال کیا کہ: "مِنْ اَیْنَ اَثْبَتَّ الْاَنْبِیَاءَ وَالرُّسُلَ؟" آپ انبیاءؑ و رسل کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں؟ امامؑ نے جواب میں مسئلۂ توحید کو بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"اِنَّا لَمَّا اَثْبَتْنَا اَنَّ لَنَا خَالِقًا صَانِعًا مُتَعَالِیًا عَنَّا وَعَنْ جَمِیْعِ مَا خَلَقَ وَکَانَ ذٰلِکَ الصَّانِعُ حَکِیْمًا مُتَعَالِیًا لَمْ یَجُزْ اَنْ یُشَاهِدَهُ خَلْقُهُ وَلَا یُلَامِسُوْهُ فَیُبَاشِرُهُمْ وَیُبَاشِرُوْهُ وَیُحَاجُّهُمْ وَیُحَاجُّوْهُ،

ثبت ان لہ سفراء فی خلقہ یعبرون عنہ الی خلقہ و عبادہ ویدلونہم علی مصالحہم و منافعہم و مابہ بقائہم و فی ترکہ فنائہم فثبت الآمرون والناہون عن الحکیم العلیم فی خلقہ ۔۔۔"

مختصر یہ کہ انبیاء و رسل کے ثابت کرنے کی بنیاد، اپنی تمام الٰہی شان و صفات کے ساتھ خود اللہ کے اثبات پر موقوف ہے جب ہم نے یہ جان لیا کہ ہمارا کوئی خالق و صانع ہے جو حکیم ہے اور ہم سے اعلیٰ و ارفع ہے یعنی ہم اپنے حواس و ادراک کے ذریعہ اس سے براہ راست ارتباط پیدا نہیں کر سکتے۔ نہ اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اور نہ اسے چھو سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے دو بدو سوال و جواب کر سکتے ہیں جبکہ ہم اس کے محتاج ہیں کہ وہ ہماری راہنمائی کرے۔ کیونکہ فقط وہی حقیقی حکیم و دانا ہے اور ہمارے واقعی مصالح و مفادات سے آگاہ ہے۔ لہٰذا ایسے وجود کا ہونا ضروری ہے جو بیک وقت دو پہلوؤں کا حامل ہو: ایک طرف وہ خدا سے ارتباط رکھتا ہو یعنی اس پر وحی نازل ہوتی ہو اور دوسری طرف ہم اس سے رابطہ قائم کر سکتے ہوں۔ اور ایسے افراد کا ہونا لازم و واجب ہے۔

اس کے بعد امامؑ ان افراد کے بارہ میں فرماتے ہیں "حکماء مؤدبین بالحکمۃ" خود ان لوگوں کو حکیم و دانا ہونا چاہیئے، وہ حکمت کی بنیاد پر مؤدب و مہذب کئے گئے ہوں۔ "مبعوثین بہا" اور حکمت ہی پر مبعوث کئے گئے ہوں یعنی ان کی دعوت اور ان کا پیغام حکمت پر مبنی ہو۔ "غیر مشارکین للناس علی مشارکتہم لہم فی الخلق" اگرچہ وہ خلقت کے اعتبار سے انسانوں میں شریک ہوں لیکن بعض جہات میں لوگوں سے الگ اور جدا ہوں۔ ایک انفرادی پہلو اور امتیازی روح ان میں پائی جاتی ہو۔ "مؤیدین من عند الحکیم العلیم بالحکمۃ" خدائے حکیم و علیم کی جانب سے حکمت کی بنیاد پر ان کی تائید کی گئی ہو۔ "ثم ثبت ذلک فی کل دھر و مکان" ایسے واسطوں اور ذریعوں کا وجود ہر زمانہ اور ہر عہد میں لازمی و ضروری ہے۔

"لکیلا تخلوا الارض من حجۃ یکون معہ علم یدل علی صدق مقالتہ و جواز عدالتہ" تاکہ زمین کسی وقت بھی ایسی حجت سے خالی نہ رہے جس کے پاس اس کی صداقت گفتار اور اس کی عدالت رفتار کے ثبوت میں کوئی علم (دلیل یا معجزہ) موجود ہو۔

زید بن علیؑ اور مسئلہ امامت

زید ابن علیؑ ابن الحسینؑ امام محمد باقرؑ کے بھائی ہیں اور صالح و محترم شخص ہیں۔ ہمارے ائمہؑ نے آپ کی اور آپ کے مجاہدانہ اقدام کی تعریف کی ہے۔ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ جناب زید واقعاً خود اپنے لئے خلافت کے مدعی تھے یا صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے رہے تھے اور خود خلافت کے دعویدار نہیں تھے بلکہ آپ امام محمد باقرؑ کی خلافت کے خواہاں تھے۔ یہ بہر حال مسلم ہے کہ ہمارے ائمہؑ نے آپ کی تعریف و توصیف کی ہے اور آپ کو شہید کہا ہے۔ اور یہی ان کی عظمت کے لئے کافی ہے کہ: "مَضیٰ وَاللهِ شَهِیداً" وہ شہید ہو کر دنیا سے اٹھے لیکن بحث اس بات پر ہے کہ آپ خود اس مسئلہ (امامت) میں شبہ کا شکار تھے یا نہیں؟ جو روایت اس وقت میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خود اس سلسلہ میں شبہ میں مبتلا تھے۔ اب یہ بات کہ ایسا شخص اس مسئلہ میں شبہ کا شکار کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ایک دوسری بحث ہے۔

امام محمد باقرؑ کے ایک صحابی ابو جعفر احول بیان کرتے ہیں: جس وقت زید بن علی مخفی تھے انہوں نے میرے پاس پیغام بھیجا اور مجھ سے فرمایا کہ اگر ہم میں سے کوئی جہاد کے لئے قیام کرے تو کیا تم ہماری مدد کے لئے آمادہ ہو؟ میں نے جواب دیا اگر آپ کے پدر بزرگوار اور بھائی (حضرت امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ) اجازت دیں تو میں حاضر ہوں ورنہ نہیں۔ زید نے فرمایا، میں خود قیام کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بھائی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ کیا اب بھی تم ہماری حمایت پر آمادہ ہو؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے پوچھا کیوں؟ کیا تم ہمارے سلسلہ میں اپنی جان سے دریغ کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اِنَّمَا هِیَ نَفْسٌ وَاحِدَةٌ فَاِنْ کَانَ لِلّٰهِ فِی الْاَرْضِ حُجَّةٌ فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْكَ نَاجٍ وَالْخَارِجُ مَعَكَ هَالِكٌ وَاِنْ لَا تَكُنْ لِلّٰهِ حُجَّةٌ فِی الْاَرْضِ فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْكَ وَالْخَارِجُ مَعَكَ سَوَاءٌ" میں ایک ہی جان رکھتا ہوں اور آپ بھی حجت خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اگر زمین پر آپ کے علاوہ کوئی حجت خدا ہے تو جو شخص آپ کے ساتھ قیام کرے اس نے خود کو ضائع کیا بلکہ ہلاک ہوا اور جس نے آپ سے انکار کیا

اس نے نجات پائی لیکن اگر زمین پر کوئی حجت خدا نہ ہو تو میں چاہے آپ کے ساتھ قیام کروں یا نہ کروں دونوں باتیں برابر ہیں ۔

ابو جعفر احول جانتے تھے کہ زید کا مقصد کیا ہے ۔ لہٰذا وہ اس حدیث کے ذریعہ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر ایک "حجت" موجود ہے ۔ اور وہ آپ کے بھائی امام محمد باقرؑ ہیں ۔ آپ نہیں ہیں ۔ یہاں روایت میں حضرت زید کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی جبکہ میں امام کا فرزند ہوتے ہوئے اس نکتہ سے واقف نہیں ہوں اور میرے پدر بزرگوار نے بھی مجھے نہیں بتایا ؟ کیا میرے بابا مجھے چاہتے نہیں تھے ؟ خدا کی قسم میرے بابا مجھے اس قدر چاہتے تھے کہ مجھے بچپن میں دستر خوان پر اپنی آغوش میں بٹھاتے تھے اور اگر نوالہ گرم ہوتا تھا تو پہلے اسے ٹھنڈا کرتے تھے اس کے بعد کھلاتے تھے تاکہ میرا دہن نہ جلنے پائے وہ باپ جو مجھ سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ اسے ایک لقمہ کے ذریعہ میرا دہن جلنا گوارہ نہ تھا ۔ کیا اس نے اتنی اہم بات جسے تم سمجھے ہو ، مجھے بتانے سے مضائقہ کیا تاکہ میں جہنم کی آگ سے محفوظ رہوں ؟ (ابو جعفر احول نے) جواب دیا ۔ انہوں نے آپ کو جہنم کی آگ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہی نہیں بتایا ۔ چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے تھے اس لئے آپ کو نہیں بتایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر میں کہہ دوں گا تو آپ انکار کریں گے اور جہنمی ہو جائیں گے چونکہ وہ آپ کی طبیعت کی تیزی سے واقف تھے لہٰذا آپ سے بتانا نہیں چاہا ۔ اور یہی بہتر سمجھا کہ آپ لاعلمی کی حالت پر باقی رہیں تاکہ کم از کم آپ میں عناد نہ پیدا ہونے پائے ۔ لیکن یہ بات مجھ سے فرما دی تاکہ اسے قبول کر کے نجات حاصل کر لوں یا انکار کر کے جہنمی بن جاؤں .... اور میں نے بھی اسے قبول کر لیا ۔

اس کے بعد میں نے زید سے دریافت کیا : "اَنْتُمْ اَفْضَلُ اَمِ الْاَنْبِیَاءُ" آپ افضل ہیں یا انبیاء ؟ فرمایا انبیاء ۔ "قُلْتُ یَقُولُ یَعْقُوبُ لِیُوسُفَ یَا بُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْیَاكَ عَلٰی اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوا لَكَ كَیْدًا" میں نے عرض کیا یعقوبؑ جو پیغمبر ہیں اپنے بیٹے یوسفؑ سے جو خود بھی پیغمبر اور ان کے جانشین ہیں ، کہتے ہیں کہ اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ۔ آیا یعقوبؑ کا یہ حکم یوسفؑ کے بھائیوں سے دشمنی کی بنا پر تھا یا ان کی اور یوسفؑ کی دوستی کی بنیاد پر تھا چونکہ وہ یوسفؑ کے بھائیوں کی طبیعت سے واقف تھے کہ اگر وہ سمجھ گئے کہ یوسفؑ اس مقام منزلت

پر فائز ہونے والے ہیں تو ابھی سے ان کی دشمنی پر کمر بستہ ہو جائیں گے"۔ آپ کے ساتھ آپ کے پدر بزرگوار اور بھائی کا قصہ بالکل یعقوبؑ و یوسفؑ اور ان کے بھائیوں جیسا ہے۔

گفتگو کے اس مرحلہ پر آ کر زید بالکل خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دے سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے فرمایا: "اَمَا وَاللهِ لَئِنْ قُلْتَ ذٰلِكَ" "اب جبکہ تم مجھ سے یہ بات کہہ رہے ہو تو میں بھی تمہیں یہ بتا دوں کہ: لَقَدْ حَدَّثَنِیْ صَاحِبُكَ بِالْمَدِیْنَةِ" تمہارے آقا (یہاں مراد امام ہیں تمہارے امام یعنی میرے بھائی امام محمد باقرؑ) نے مدینہ میں مجھ سے فرمایا ہے: "انی اُقتل واُصلب بالکناسۃِ" کہ تمہیں قتل کیا جائے گا اور کناسہ کوفہ پر سولی دی جائے گی۔ "وَاِنَّ عِنْدَهٗ لَصحیفۃ فیھا قتلی وصلبی" اور ان کے پاس ایک صحیفہ (کتاب) ہے جس میں میرے قتل کئے جانے اور دار پر چڑھائے جانے کا ذکر ہے۔

یہاں زید، ابو جعفر کے سامنے ایک دوسرا ورق الٹتے ہیں کیونکہ یک بیک بات ایک دم بدل جاتی ہے اور وہ دوسرے نظریہ کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس سے قبل جو باتیں آپ ابو جعفر سے فرما رہے تھے گویا اس سے اپنے آپ کو پنہاں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ ابو جعفر مسئلہ امامت کے سلسلہ میں اس قدر راسخ الاعتقاد ہیں تو خود سے فرمایا کہ ان کو بتا دوں کہ میں بھی اس نکتہ سے غافل نہیں ہوں۔ وہ کہیں شبہ کا شکار نہ ہوں، میں بھی اس مسئلہ کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ اس کا اعتراف و اعتقاد بھی رکھتا ہوں۔ گفتگو کے آخری جملہ میں اسی مطلب کا اظہار ہے کہ میں پورے علم و ارادہ کے ساتھ نیز اپنے بھائی کے حکم سے جہاد کے لئے اٹھ رہا ہوں۔ یہاں تک کہ (ابو جعفر) کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد ایک سال میں مکہ مکرمہ گیا اور وہاں میں نے یہ پورا واقعہ حضرت امام صادقؑ سے بیان کیا۔ حضرت نے بھی میرے نظریات کی تائید کی۔

حضرت امام صادقؑ سے دو اور حدیثیں

امامؑ ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: "اِنَّ الْاَرْضَ لَا تَخْلُوْ اِلَّا وَفِیْهَا اِمَامٌ" زمین کبھی بھی امام سے خالی نہیں رہتی۔ نیز حضرتؑ سے ایک اور حدیث نقل ہے: "لَوْ بَقِیَ اثْنَانِ لَکَانَ اَحَدُهُمَا الْحُجَّةَ عَلٰی صَاحِبِهٖ" اگر روئے زمین پر دو شخص بھی باقی رہیں تو ان میں

کا ایک اپنے ساتھی پر خدا کی حجت ہوگا۔

حضرت امام رضاؑ سے ایک روایت

اس سلسلہ میں ہمارے یہاں بہت سی حدیثیں موجود ہیں۔ ایک مفصل روایت جو امام رضاؑ سے مروی ہے ملاحظہ فرمائیں۔ عبدالعزیز بن مسلم کا بیان ہے کہ: "کُنّا مَعَ الرِّضا علیہ السّلام بِمَرو فَاجتَمَعنا فِی الجامِعِ یَومَ الجُمعَةِ فی بَدءِ مَقدَمِنا" ہم مرو میں امام رضاؑ کے ہمراہ تھے (یہ اس سفر کی بات ہے جب امامؑ ولی عہدی کے سلسلہ میں خراسان لے جائے جا رہے تھے) جمعہ کے دن ہم مرو کی جامع مسجد میں بیٹھتے تھے اور امام جماعت موجود نہیں تھا لوگ جمع ہو کر مسئلہ امامت پر گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ساری باتیں بیان کر دیں۔ امامؑ نے تمسخر آمیز تبسم فرمایا کہ آخر یہ لوگ کیا سوچتے ہیں؟! یہ لوگ دراصل موضوع (امامت) کو ہی نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: "جَهِلَ القَومُ وَخُدِعُوا عَن أدیانِهِم" یہ لوگ جاہل ہیں اور انہوں نے اپنے افکار و عقائد میں دھوکہ کھایا ہے خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ کو اس وقت تک نہیں اٹھایا جب تک دین کامل نہیں ہوا۔ اس نے قرآن نازل فرمایا جس میں حلال، حرام، حدود و احکام اور وہ تمام باتیں جن کی دین کے سلسلہ میں انسان کو ضرورت ہے سب بیان کر دیں اور اعلان کر دیا: "مَا فَرَّطنَا فِی الکِتابِ مِن شَیءٍ" ہم نے اس کتاب (قرآن مجید) میں کسی بھی چیز کو نہیں چھوڑا ہے یعنی سب کچھ بیان کر دیا ہے (اس سے مراد حرام و حلال سے متعلق قرآن کے احکام اور انسانوں کے تمام فرائض ہیں) اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں پیغمبر اسلامؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کی تلاوت بھی فرمائی: "اَلیَومَ أکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَأتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتی وَرَضِیتُ لَکُمُ الإسلامَ دِیناً" یعنی آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے لئے اسلام سے راضی ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت امام رضاؑ نے فرمایا "وَأمرُ الإمامَةِ مِن تَمامِ الدِّینِ" اور مسئلہ امامت دین کو تمام و کامل کرنے والے مسائل میں سے ایک ہے۔ "وَلَم یَمضِ حَتّیٰ بَیَّنَ لِاُمَّتِهِ مَعالِمَ دِینِهِم" پیغمبرؐ اس وقت تک تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ انہوں نے

اپنی امت کے درمیان ہدایت کی نشانیوں کو بیان نہ کر دیا اور ان کے لئے دین کی راہ روشن نہ کر دی۔ "وَ اَقَامَ لَهُمْ عَلِيّاً عَلَماً" اور ان کے لئے علیؑ کو راہنما مقرر فرما دیا۔

مختصر یہ کہ قرآن پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ ہم نے کسی بھی امر کو فراموش نہیں کیا۔ اب یہ کہ کیا اس نے تمام جزئیات بھی ----- بیان کر دیئے ؟ یا نہیں " بلکہ فقط کلیات واصول بیان کئے ہیں اور ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کی لوگوں کو ضرورت تھی۔ ان ہی کلیات واصول میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے (پیغمبر اکرمؐ کے بعد کے لئے) ایک ایسے انسان کا تعارف کرا دیا جو قرآن کی تفسیر اس کے معانی کی وضاحت نیز اس کے کلیات کی تشریح سے واقف ہے۔ اس کا یہ علم اجتہاد کی بنیاد پر نہیں ہے۔ جس میں کچھ باتیں صحیح ہوں اور کچھ غلط (بلکہ وہ علم الٰہی کے ذریعہ ان چیزوں سے آگاہ ہے) اور حقیقت اسلام اس کے پاس محفوظ ہے۔ پس قرآن یہ جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام چیزیں بیان کر دیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی۔ ہم نے کلیات کے ساتھ ساتھ جزئیات بھی بیان کر دیئے ہیں اور انھیں ایک " دانا " کے پاس محفوظ کر دیا ہے۔ اور ہمیشہ اسلام سے آگاہ ایک شخص لوگوں کے درمیان موجود رہتا ہے۔ "مَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يُكْمِلْ دِيْنَهُ فَقَدْ رَدَّ كِتَابَ اللّٰهِ" اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خداوند نے اپنا دین کامل نہیں کیا تو اس نے قرآن کے خلاف بات کہی ہے اور جو بھی قرآن کو رد کرے کافر ہے۔ "وَهَلْ يَعْرِفُوْنَ قَدْرَ الامامة ومحلها من الامة فيجوز فيها اختيارهم" جو لوگ کہتے ہیں کہ امامت انتخابی ہے کیا وہ جانتے بھی ہیں کہ امام کے کیا معنی ہیں ؟ ان لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ امام کا انتخاب کسی سپہ سالارِ لشکر کے انتخاب کے مانند ہے، جبکہ امام وہ ہے کہ (جس کی تعیین پر قرآن فرماتا ہے کہ میں نے دین کامل کر دیا۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے جزئیات قرآن میں نہیں ہیں، حقیقت اسلام اس (امام) کے پاس ہے۔ کیا لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا شخص کون ہے کہ خود اسے منتخب کر لیں ؟ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کہا جائے کہ پیغمبر کا انتخاب ہم خود ہی کرتے ہیں !

"اِنَّ الْاِمَامَةَ اَجَلُّ قَدْراً وَ اَعْظَمُ شَاناً وَ اَعْلٰى مَكَاناً وَ اَمْنَعُ جَانِباً وَ اَبْعَدُ غَوْراً مِنْ اَنْ يَبْلُغَهَا النَّاسُ بِعُقُوْلِهِمْ اَوْ يَنَالُوْهَا بِآرَائِهِمْ"

" امامت انسان کی فکری حدود سے اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اسے انتخابی قرار دیا جائے اسی مسئلہ کو انتخابی کہا جانا چاہیئے جسے لوگ واقعی طور پر تشخیص دے سکیں، جن مسائل میں انسان خود تشخیص کی صلاحیت رکھتا ہے وہاں دین کبھی براہ راست مداخلت نہیں کرتا۔ اور بنیادی طور پر ایسے مسائل میں دین کی براہ راست مداخلت بالکل غلط ہے، کیونکہ ایسی صورت میں سوال اٹھے گا کہ پھر انسان کی فکر و عقل آخر کہاں کام آئے گی؟ جہاں تک انسانی فکر و عقل کا دائرہ ہے انسان خود انتخاب کرے لیکن جو بات عقل بشر کی حد سے خارج اور بالاتر ہے، اس میں انتخاب کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ (امامت) قدر و منزلت کے اعتبار سے بہت بلند، شان کے اعتبار سے بہت عظیم، مرتبہ کے اعتبار سے بہت عالی ہے، اس کی دیواریں ناقابل عبور ہیں اور وہ عقل و فکر کی حد سے باہر ہے" انسان اپنی عقل کے ذریعہ امام کو درک نہیں کر سکتے نہ اس تک اپنی آراء کے ذریعہ رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اپنے اختیار سے اس کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ " اِنَّ الامامۃ خصَّ اللہُ عزَّ وجلَّ بھا ابراھیمَ الخلیلَ بعدَ النبوۃِ والخُلّۃ "، اگر امامت کے حقیقی معنی سمجھنا چاہتے ہو تو یہ جان لو کہ (امامت) ان تمام مسائل سے الگ ہے جن کا آج لوگ اظہار کرتے ہیں کہ پیغمبر کا ایک خلیفہ و جانشین منتخب کریں، لیکن یہ جانشین پیغمبر صرف لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرے۔ امامت تو اصل میں وہ منصب ہے کہ ابراہیمؑ جیسا پیغمبر نبوت کے بعد اس تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اس منصب پر فائز ہونے کے بعد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے خدا کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے " وَمِنْ ذُرِّیَّتِی " خداوندا میری ذریت میں سے کچھ افراد کو بھی یہ منصب عطا فرما۔ ابراہیمؑ جانتے ہیں کہ یہ عظیم منصب ان کی تمام ذریت کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ جواب دیا جاتا ہے " لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ " یہ وہ منصب ہے جو ظالم کو نہیں مل سکتا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ کیا ظالم ہر حال میں ظالم ہے چاہے ماضی میں وہ ظالم رہا ہو یا پہلے نیک اور صالح رہا ہو کیونکہ یہ محال ہے کہ ابراہیمؑ کہیں، خدایا (یہ منصب) میری ذریت میں سے ظالموں کو عطا فرما۔ پس بہر حال ان کی نظر میں آپ کی نیک اور صالح اولاد ہی رہی ہے۔ چنانچہ خداوند عالم کی طرف سے جواب ملا کہ یہ منصب آپ کی ذریت میں سے ان کو عطا ہوگا جن کا ظلم سے سابقہ نہ رہا ہو۔

"فَابطلت هٰذهِ الآيَة اِمَامَةَ کُلّ ظَالم اِلیٰ یوم القیامة وصارت فِی الصَّفوَة" یہ منصب ان منتخب افراد میں ہے یعنی ذریت حضرت ابراہیمؑ میں اہل صفوة (منتخب اور بہترین) افراد کو عطا ہوا ہے۔ (صفوة یعنی مکھن کے مانند ایک ایسی چیز جسے مٹھا کر اوپر سے نکال لیتے ہیں اور وہی "زبدہ" کہلاتا ہے) ثُمَّ اکرمہُ اللّٰہُ تعالیٰ بِاَن جَعلَها فِی ذُرِّیَّتِهٖ اَهلَ الصِّفوَةِ وَالطَّهَارَةِ "اس کے بعد خداوند عالم نے امامت کو بزرگ و مکرم بنایا اور وہ اس عنوان سے کہ اسے) صفوة اور اہل طہارت یعنی ذریت ابراہیم میں صاحبان عصمت کا حصہ قرار دیا۔ اس کے بعد امامؑ قرآن کی آیات سے استدلال فرماتے ہیں:

وَوَهَبنَا لَهٗ اِسحٰقَ وَیَعقُوبَ نَافِلَةً وَکُلًّا جَعَلنَا صَالِحِینَ وَجَعَلنَاهُم اَئِمَّةً یَّهدُونَ بِاَمرِنَا وَاَوحَینَا اِلَیهِم فِعلَ الخَیرَاتِ [1]

اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ و یعقوبؑ جیسے فرزند عطا کئے اور ہم نے ان سب کو نیکوکار و صالح (نبی) قرار دیا۔ اور ان کو لوگوں کا ہادی و پیشوا قرار دیا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے تھے، اور ہم نے ان کی طرف نیک اعمال بجالانے کی وحی کی۔

قرآن مجید میں اس نکتہ پر کافی زور دیا گیا ہے کہ ذریت حضرت ابراہیمؑ کو منصب امامت سے نوازا گیا ہے۔

اس کے بعد امامؑ فرماتے ہیں: فَمِن اَینَ یَختَارُ هٰؤُلَاءِ الجُهَّال "آخر وہ مقام و منصب جو حضرت ابراہیمؑ کو نبوت کے بعد عطا ہوا، یہ نادان اسے آخر کس طرح انتخاب کرنا چاہتے ہیں؟ کیا بنیادی طور پر یہ منصب انتخاب کے ذریعہ حاصل بھی کیا جا سکتا ہے؟!" اِنَّ الاِمَامَةَ هِیَ مَنزِلَةُ الاَنبِیَاءِ وَاِرثُ الاَوصِیَاءِ" امامت دراصل مقام انبیاء اور میراث اوصیاء ہے۔ یعنی یہ ایک وراثتی امر و منصب ہے لیکن قانونی میراث کے عنوان سے نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ اس کی استعداد و صلاحیت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوئی ہے۔ "اِنَّ الاِمَامَةَ خِلَافَةُ اللّٰهِ" امامت خلافت الٰہی ہے جو سب سے پہلے آدمؑ کو عطا ہوئی۔ "وَخِلَافَةُ الرَّسُولِ" اور خلافت پیغمبر ہے۔ اس کے بعد

۱۔ سورۂ انبیاء، آیت نمبر ۷۲-۷۳

امام فرماتے ہیں: "اِنَّ الْاِمَامَةَ زِمَامُ الدِّیْنِ..." امامت زمام دین، نظام مسلمین، صلاح وفلاح دنیا، عزت مسلمین، اسلام کی اصل واساس اور اس کا بنیادی تنا ہے۔ "بِالْاِمَامِ تَمَامُ الصَّلٰوۃِ وَالزَّکوٰۃِ وَالصِّیَامِ وَالْحَجِّ وَالْجِھَادِ..." تا آخر۔ یعنی امام ہی کے ذریعہ نماز، زکوٰۃ، روزہ حج، جہاد اور دیگر اسلامی احکام وادامر کامل ہوتے ہیں۔

نتیجہ

مذکورہ بالا تمام باتوں سے ایک اساسی وبنیادی منطق ہمارے ہاتھ آتی ہے۔ ہاں اگر بالفرض کوئی اسے بھی قبول نہ کرے تو اور بات ہے۔ یہ منطق ان سطحی ومعمولی مسائل سے بالکل الگ کہ اکثر متکلمین کی طرح ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اسلام کے بعد ابوبکر خلیفہ ہوئے اور علیؑ چوتھے خلیفہ ہوئے۔ آیا علیؑ کو پہلا خلیفہ ہونا چاہیئے یا مثلاً چوتھا؟ آیا ابوبکر میں امامت کے شرائط پائے جاتے تھے یا نہیں؟ اس کے بعد ہم شرائط امامت کو مسلمانوں کی حاکمیت کے عنوان سے دیکھنا اور پرکھنا شروع کریں۔ البتہ یہ بھی ایک بنیادی واساسی مطلب ہے، اور شرائط حاکمیت کے اعتبار سے بھی شیعوں نے اعتراضات کئے ہیں اور بجا اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن اصولی طور پر مسئلہ امامت کو اس انداز سے بیان کرنا ہی صحیح نہیں ہے کہ ابوبکر میں امامت کے شرائط پائے جاتے تھے یا نہیں۔ اصل میں خود اہل سنت بھی ان کے لئے اس منصب کا اقرار نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں اہل سنت کے عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمؑ وابراہیمؑ سے لے کر حضرت رسولِ اکرمؐ تک خداوند عالم نے ان افراد سے متعلق انسان کے جتنے ماوراء الطبیعی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے آنحضرتؐ کے بعد تمام ہو گئے۔ پیغمبر اکرمؐ کے بعد اب تمام انسان معمولی اور ایک جیسے ہیں۔ اب صرف علماء ہیں جو پڑھنے لکھنے کے بعد عالم ہوئے ہیں اور ان سے کبھی غلطی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ یا حکام ہیں جن میں سے بعض عادل ہیں اور بعض فاسق۔ اب یہ مسئلہ امامت ان ہی کے درمیان دائر ہوتا ہے ——— اب وہ باب جو ہمارے یہاں حجت الٰہیہ کے نام سے پایا جاتا ہے، یعنی وہ افراد جو عالم ماوراء الطبیعہ یا عالم بالا سے ارتباط رکھتے ہیں، (ان کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ) پیغمبر اکرمؐ کے بعد وہ بساط ہی لپیٹ دی گئی ہے۔

شیعہ جواب دیتے ہیں کہ (پیغمبر اکرمؐ کے بعد) رسالت کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ اب کوئی دوسرا انسان کوئی نیا دین و آئین لے کر نہیں آئے گا۔ دین ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ہے اسلام، پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ لیکن حجت اور انسان کامل کا مسئلہ اور اس کی ضرورت انسانوں کے درمیان ہرگز تمام نہیں ہوئی ہے، کیونکہ روئے زمین پر پہلا انسان اس طرح کا تھا اور آخری انسان بھی ان ہی صفات کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ اہل سنت میں صرف صوفیا کا طبقہ ایسا ہے جو ایک دوسرے نام سے سہی، اس مطلب کو تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے اہل سنت اگرچہ صوفی ہیں لیکن جیسا کہ ان کے بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے انہوں نے مسئلہ امامت کو اسی عنوان سے قبول کیا ہے۔ جیسے شیعہ مانتے ہیں۔

محی الدین عربی، اندلس کا رہنے والا ہے۔ اور اندلس وہ جگہ ہے جہاں کے رہنے والے نہ صرف سنی تھے بلکہ شیعوں سے عناد بھی رکھتے تھے اور ان میں ناصبیت کی بو پائی جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اندلس کو امویوں نے فتح کیا اور بعد میں برسہا برس وہاں ان کی حکومت رہی۔ اور چونکہ یہ لوگ بھی اہل بیتؑ کے دشمن تھے لہٰذا علمائے اہل سنت میں زیادہ تر ناصبی علماء اندلسی ہیں۔ شاید اندلس میں شیعہ ہوں بھی نہیں اور اگر ہوں گے بھی تو بہت کم اور نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔

بہرحال یہ محی الدین اندلسی ہے، لیکن اپنے عرفانی ذوق کی بنیاد پر وہ اس بات کا معتقد ہے کہ زمین کبھی کسی ولی یا حجت سے خالی نہیں رہ سکتی۔ یہاں وہ شیعی نظریہ کو قبول کرتے ہوئے ائمہ علیہم السلام کے ناموں کا ذکر کرتا ہے، یہاں تک کہ حضرت حجتؑ کا نام بھی لیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے سن چھ سو کچھ ہجری میں حضرت محمدؑ بن حسن عسکریؑ سے فلاں مقام پر ملاقات کی ہے۔ البتہ بعض باتیں اس نے ایسی کہی ہیں جو اس کی ایک دم مذہبی اور وہ بنیادی طور پر ایک متعصب سنی ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ اس کا ذوق عرفانی تقاضہ کرتا ہے کہ صوفیوں کے مطابق زمین کبھی کسی "ولی" (اور ہمارے ائمہؑ کے مطابق حجت) سے خالی نہیں رہ سکتی، اس مسئلہ کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ مشاہدہ و ملاقات کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ میں حضرت محمدؑ بن حسن عسکریؑ کی خدمت میں پہنچ چکا ہوں، اور اس وقت جبکہ ان کی عمر تین سو کچھ برسوں سے زیادہ ہو چکی ہے اور وہ مخفی ہیں، میں ان کی زیارت سے شرفیاب ہوا ہوں۔

"پس قرآن یہ جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام چیزیں بیان کر دیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی۔ ہم نے کلیات کے ساتھ ساتھ جزئیات بھی بیان کر دیئے اور انھیں ایک "دانا" کے پاس محفوظ کر دیا ہے اور ہمیشہ اسلام سے آگاہ ایک شخص لوگوں کے درمیان موجود رہتا ہے "من زعم ان اللہ عزوجل لم یکمل دینہ فقد رد کتاب اللہ" اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ نے اپنا دین کامل نہیں کیا تو اس نے قرآن کے خلاف بات کہی ..... "جو لوگ کہتے ہیں کہ امامت انتخابی ہے کیا وہ جانتے ہیں کہ امامت کے کیا معنیٰ ہیں؟"

(اسی کتاب سے ماخوذ)

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۱۵۵/۶۱۸۷

تہران۔ جمہوری اسلامی ایران

ISBN 964-6177-08-5